نصابِ وفا

آخرت کی "سزا جزا" کے علاوہ اس دنیا میں بھی مکافات کا نظام قائم ہے ہم غور کریں تو یہ "مکافاتِ عمل" ہمیں اپنے اردگرد روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ قدرت کے ہاتھ میں ایک انتہائی حساس ترازو ہے جس میں ہر خوشی کے بدلے ایک دکھ اور ہر دکھ کے بدلے ایک خوشی تول کر دی جاتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار اس "ترازو" کی موجودگی پر کامل یقین رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے حصے کے غم بڑی فراخ دلی سے جھیل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے حصے کی خوشی اسے ملے گی۔

خوشی........ جو ایک "دلنواز محبوبہ" تھی۔

میری کہانی کا آغاز آج سے کوئی دس سال پہلے ہوا۔ شباب کا آغاز تھا اور بہار کا دن، وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی جب میں نے اپنی زندگی کا پہلا محبت نامہ لکھا تھا اور نتائج سے بے پروا ہو کر کرن کے گھر پھینک دیا تھا۔ کرن اپنے نام ہی کی طرح چھریرے بدن کی ایک اجلی اور دلکش لڑکی تھی، ہماری بستی سے چند فرلانگ دور ایک فیشن ایبل آبادی میں رہتی تھی بہار کی اس چمکیلی دوپہر کو کرن کے گھر پھینکا ہوا میرا محبت نامہ ایک رومان پرور اور دلنشین دور کا نکتہ آغاز ثابت ہوا، وہ کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی میں بھی سال سوم میں تھا اکثر تو نہیں، کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی، کبھی بس اسٹاپ پر کبھی کالج کے راستے میں، کبھی کسی کیفے کے کیبن میں ہم ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے اور وقت کا بے رحم گھڑیال بج اٹھا، وہی گھڑیال جو صدیوں سے بجتا آیا ہے۔ جب کسی کا سر کسی کے شانے پر ڈھلکتا ہے...... جب بھی دو چاہنے والے کوئی حسین سپنا دیکھنے لگتے ہیں، یہ گھڑیال بج اٹھتا ہے، منادی کر دیتا ہے کہ خبردار، ہوشیار ہو جاؤ محبت کی جا رہی ہے۔ سیکڑوں زہریلی نگاہیں اور الزام تراش انگلیاں جاگ اٹھتی ہیں اور بدنصیب عاشقوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ کرن کی مالی حیثیت مجھ سے اچھی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا چچا بھی سخت گیری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ کرن کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور اسے اس کے چچا نے پالا پوسا تھا۔ وہ علاقے کا ایک بااثر شخص تھا اور نہایت غصیلا بھی، بااثر لوگ عموماً باخبر بھی ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی ہماری محبت خوشبو بن کر اڑی، سیدھی کرن کے چچا محترم کی ناک میں جا گھسی اور انہیں چونکہ "خوشبو" سے الرجی تھی، وہ خوفناک قسم کی چھینکیں مارنے لگے۔ ان دھواں دھار چھینکوں نے جہاں کرن کو سہما دیا وہاں میرے حوصلوں کو بھی پست کر دیا۔ ہجر کا ایک طویل موسم ہم

دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ کرن کو اب اس کا پندرہ سالہ چچا زاد بھائی کالج لے کر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کا گھر سے نکلنا بے حد کم ہو گیا۔

ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے گزارش احوال کی...... میرے اصرار پر انہوں نے ڈرتے ڈرتے میرے والد سے بات کی (والد صاحب ایک بیمہ کمپنی میں ہیڈ کلرک تھے) اگلے روز علی الصباح درس حدیث شریف دینے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور نہایت دھیمے لہجے میں انہوں نے بات کا آغاز کیا اور بتدریج اپنے جلالی موڈ کی طرف بڑھتے رہے۔ پند و نصائح کے اس طویل دورانئے کا اختتام ان گرجدار فقروں پر ہوا۔

"تو ایک دیوث انسان ہے، تجھ جیسے بیکار کو تو دھکے دے کر گھر سے نکال دینا چاہیے نابنجار، لڑکیاں بھی کوئی گاجریں مولیاں ہوتی ہیں کہ گئے اور کھیت سے توڑ لائے۔ ابھی ٹھیک سے ناک صاف کرنا آتی نہیں اور چلا ہے نواب زادہ رشتے ڈھونڈنے...... ابھی تو ہے کیا؟ تیری اوقات کیا ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔

میں حسب معمول کان لپیٹ کر باہر نکل آیا سمجھدار نوجوان ایسے موقعوں پر ایسا ہی کیا کرتے ہیں...... شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں فلسفے میں ایم اے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور بی اے میں فلسفہ ہی میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ دوسرا نمبر سائیکالوجی تھا۔ میرے انتخاب سے آپ کو میرے فطری رجحان کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ درحقیقت میں پیدائشی طور پر ایک تخیل پسند شخص ہوں اور غور و فکر میری گھٹی میں شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس غور و فکر کے سبب کبھی کبھار ہی کسی کارآمد نتیجے پر پہنچ پاتا ہوں۔ میں اسے سوچ کی ناکامی نہیں کہوں گا، ہاں اس خام خیالی کو ایک تدریجی عمل کہا جا سکتا ہے۔

عشق و محبت کا کاروبار سرد پڑا اور والد گرامی سے دھواں دھار پھٹکار سنی تو میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ جاگ اٹھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا، کچھ ثابت کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ ان دنوں میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا رہتا تھا۔ چھت پر لیٹا ہوں اور سوچ رہا ہوں، کبھی خیال آتا کہ فلسفہ اور سائیکالوجی پر لعنت بھیجوں اور کرکٹ کھیلنا شروع کر دوں۔ خوب محنت کر کے اس میدان میں نام کمانے کی کوشش کروں، تھوڑی ہی دیر بعد اس خیال کو رد کر دیتا اور اخبار لے کر بیٹھ جاتا انداز ایسا ہوتا کہ جیسے آج ہی پوری دنیا کے سیاسی حالات کو ازبر کر لوں گا اور کل سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دوں گا...... بس ایسے ہی اوٹ پٹانگ خیالات پر سوچتے سوچتے ایک روز ذہن جوڈو کرانے

کی طرف مائل ہو گیا ان دنوں جگہ جگہ کراٹے کلب کھل چکے تھے اور نوجوانوں نے اس
کھیل میں شوق ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔

اپنے ایک لنگوٹیے کے ہمراہ میں نے ایک اچھے کلب میں داخلہ لے لیا اور
نہایت سنجیدگی سے تربیت لینا شروع کر دی۔ جوڈو کراٹے ایک صحت مندانہ کھیل ہے اور
نوجوانوں کی فالتو توانائی کو خود میں جذب کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے......... چند
مہینے کے اندر میں اپنے کلب کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگا۔ اس سے میری حوصلہ
افزائی ہوئی اور میں مزید لگن سے سیکھنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ
بھی تھی کہ میں ایک عقیدے پر پختہ یقین رکھتا تھا......... بلکہ اب بھی رکھتا ہوں، اس
عقیدے کو انگلش زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "نو پین......... نو گین" یعنی جب
تک کوئی تکلیف نہ اٹھائی جائے خوشی یا کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ یہ ایک وسیع
موضوع ہے اور اس کے حق میں ہزاروں دلائل دیئے جا سکتے ہیں، لیکن میں زیادہ تفصیل
میں نہیں جاؤں گا۔ اپنے مخصوص فلسفیانہ خیالات کے حوالے سے میرا ایمان تھا کہ انسان
جو مشقت اٹھاتا ہے اس کا صلہ کسی نہ کسی شکل میں اسے ملتا ہوتا ہے اور مل کر رہتا ہے
یہ قدرت کا اٹل اصول ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنے
حصے کی تکلیفیں تو جھیلتا رہوں لیکن اپنے حصے کی خوشیاں قبول کرنے سے انکار کر دوں
خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں۔ صرف ایک شکل کو اپنے لیے قابل قبول رکھوں یعنی کرن
کی شکل......... اس کی چاند جبیں کو اپنے پسینے کا نذرانہ پیش کروں، اس کے بدن کی ڈالی
کو اپنے خون سے سینچوں اور اس کی مانگ میں ستارے بھرنے کے لیے اپنے جسم کو ہزار
عذابوں سے گزار دوں......... انہی جذباتی سوچوں کے تحت میں نے کھیل کے میدان میں
سخت محنت کی اور ملک کے صف اول کے کھلاڑیوں میں شامل ہو گیا۔ شوق اور شہرت کی
حد تک تو یہ سب ٹھیک تھا، مگر معاشی نکتہ نظر سے دیکھا جاتا تو میں ابھی پہلی سیڑھی پر
کھڑا تھا۔ بہت تگ و دو کرتا تو اپنا چھوٹا موٹا کلب کھول کر بیٹھ جاتا یا سفارشیں وغیرہ لڑا
اور جوتیاں گھستا تو کسی سرکاری محکمے میں کھیل کی بنیاد پر معمولی نوکری مل جاتی اور یہ میری
منزل نہیں تھی۔ معمولی روزگار کا چراغ کرن کی متمول خان فیملی کی سورج کے سامنے کیا
روشنی دیتا۔ اگر مجھے کرن کو جیتنا تھا تو اس کے لئے نمایاں کامیابیوں کی ضرورت تھی۔

دس پندرہ ہزار روپے ماہوار آمدنی والا کاروبار یا کوئی دھانسو قسم کی ملازمت اس
کے علاوہ بینک بیلنس اور پلاٹس وغیرہ......... ایک ابھرتے ہوئے کراٹے کے کھلاڑی کے

لیے یہ سب کچھ ناممکن تھا۔ انہی دنوں ایک مخلص دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پانی
سے کھیر پکانا چھوڑ دوں۔ جس طرح پانی سے کھیر نہیں پک سکتی اسی طرح جوڈو کراٹے اور
اس جیسے دوسرے مشاغل کسی کو بڑا آدمی نہیں بنا سکتے پھر بھی اگر میں نے ارادہ کر ہی لیا
ہے کہ اسی میدان میں قسمت آزمائی ہے تو پھر اس کے لیے کوئی طریقہ کار ڈھونڈوں۔
اس نے کہا میں جاپان چلا جاؤں، کسی اچھے کلب کا رکن بن کر وہاں سے بلیک بیلٹ لوں
اور پاکستان آکر اپنا تربیتی ادارہ کھولوں وغیرہ وغیرہ۔

اس دوست کے دلائل خاصے وزنی تھے اور میں ان سے متاثر بھی ہوا۔ میرے
والد، جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ ایک سرکاری ملازم ہیں، ان کے ایک دوست محکمہ
سیاحت میں تھے، ان کے ذریعہ میں نے جاپان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دوست
احباب میں مشہور ہو گیا کہ میں جاپان جا رہا ہوں۔ میں بھی ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا،
میرے والد اور والدہ بھی جیسے تیسے راضی ہو گئے تھے۔ کرن کو الوداعی خط تک لکھا جا چکا
تھا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ کچھ دفتری رکاوٹیں سامنے آئیں، مالی مجبوری نے
ان رکاوٹوں کو اور سنگین بنایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کسی نے سچ کہا
ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی، رات کی سیاہی پھیلتی ہے تو پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ مایوسی
اور نامرادی کے انہی دنوں میں کرن کی ایک سہیلی کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ ایک کھاتے
پیتے کاروباری گھرانے میں کرن کی منگنی ہو رہی ہے اور ایک سال کے اندر شادی کا امکان
ہے یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔

"نو پین......... نو گین، کہاں ہے اس مقولے کا نامعقول خالق؟" میرا ذہن چلا
اٹھا، ان ڈھائی تین برسوں میں میں نے کس تکلیف سے آنکھ چرائی، کس مشقت کو گلے
نہیں لگایا......... اور کرن کی آرزو، میں اس کے لمس کی چاہت میں تنہائی اور پیاس کے
کیسے کیسے دشتوں سے نہیں گزرا کیا کچھ نہیں کیا میں نے اسے پانے کے لیے......... ناکامی
کے احساس نے میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ چند لمحوں کے لیے مجھے محسوس
ہوا جیسے ضبط و تحمل کے تمام بند ٹوٹ جائیں گے، میں راستے سے بھٹک جاؤں گا، کسی
اور ہی ڈگر پر چل نکلوں گا (مارشل آرٹ کے ناکام ہونے والے کھلاڑیوں میں سے کچھ
ایسے بھی ہوتے ہیں جو دنگا فساد اور مار پیٹ کی طرف مائل ہو کر جرائم کی راہ پر چل نکلتے
ہیں) بہرحال ایک زبردست کشمکش کے بعد میں نے سیلف کنٹرول کا سہارا لیا اور اپنی بے

تلخیوں کو کم کرنے کے لیے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید آپ اسے میرے پاگل پن سے تعبیر کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ محبت کی ناکامی کا خوف انسان کو سوختہ پا بنا کر اسکے ذہن میں وحشیں بھر دیتا ہے' اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

مجھے یاد ہے وہ دسمبر کے دن تھے میں راولپنڈی سے براستہ مری' نتھیا گلی چلا گیا' برف پڑی ہوئی تھی' شدید سردی کا آغاز ہو چکا تھا' کھلی ہوا میں پہنچتے ہی خون رگوں میں جمنے لگتا تھا میں نے نتھیا گلی کی ایک دکان سے چند ہفتوں کا سامان خورد و نوش لیا اور دو تھیلے کندھوں پر ڈال کر برف پوش پہاڑوں کی طرف نکل گیا ایک سیکنڈ ہینڈ سفری خیمہ میں راولپنڈی ہی سے لے گیا تھا۔ پہاڑوں پر جا کر کیا کروں گا' مجھے کچھ نہیں معلوم تھا' بس ذہن پر یہی خیال غالب تھا کہ مجھے اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانی ہے........ اپنی جان پر زیادہ سے زیادہ سختی کرنی ہے ممکن ہے کسی پرانی دیکھی ہوئی مارشل آرٹ کی فلم یا ناول وغیرہ کا تصور ذہن میں ہو........ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میری مہم جوئی کا اصل محرک کیا تھا۔ میں ان برف پوش پہاڑوں میں چند ہفتے قیام کے لیے گیا تھا' مگر یہ قیام طویل ہوتا چلا گیا' اس دوران میں نے خون منجمد کرنے والی سردی میں جوڈو کراٹے کی انتہائی سخت مشقیں کیں اور دو تین بار ٹھیک ٹھاک بیمار بھی ہوا لیکن اپنی دھن میں لگا رہا۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں صرف ایک انڈرویئر کے ساتھ خیمے سے نکل آتا اور ننگے پاؤں برف کے اوپر ورزش شروع کر دیتا' کئی بار خود کو برف کے گڑھے میں دفن کر دیتا اور سردی کی اذیت برداشت کرتا۔ کبھی جی میں آتا تو سخت بھوک کے باوجود فاقہ کشی شروع کر دیتا میری ڈاڑھی بڑھ چکی تھی اور بدن پر مہینوں کا میل کچیل جما تھا۔ پاؤں کے تلوے سردی سے پھٹ چکے تھے' در حقیقت میں یہاں آیا تو اس لیے تھا کہ جسم میں زیادہ سے زیادہ قوت مدافعت پیدا کروں اور خود کو کراٹے کے مقابلوں کے لیے ناقابل تسخیر بنا لوں لیکن بندہ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ میں نے جب خود کو اذیتوں کے سپرد کیا تو ان میں ایک عجیب طرح کا مزہ آنے لگا۔ میں اپنے حال میں مگن ہوتا چلا گیا۔ یہ بات نہیں کہ کرن کی یاد میرے دل سے محو ہو رہی تھی یا میرے ہاتھوں نے اس کے گرم ریشم جیسے لمس کو ترسنا چھوڑ دیا تھا۔ نہیں بلکہ بات یہ تھی' میری طبیعت میں ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میری یہ جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی' مجھے اس کا صلہ مل کر رہے گا۔ میں آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں' جستجو کروں یا نہ کروں' کرن مجھے ملے گی' میں اسے کھوؤں گا نہیں۔ یہ خیال غلط تھا یا صحیح' تاہم مجھے

اس پر پختہ یقین تھا۔ پھر چار مہینے گزر گئے۔ موسم معتدل ہونے لگا' برف اونچی ویران چوٹیوں پر باقی رہ گئی لیکن میں خود کو اپنی مہم جوئی ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ایک عجیب طرح کی آوارگی اور خود فراموشی دل میں راہ پا رہی تھی۔ اس "خود فراموشی کی انگلی تھام کر میں نے ان سنسان اور کم آباد پہاڑوں میں گھومنا جاری رکھا........ بہار گزر گئی' مختصر گرمیاں بھی اختتام کو پہنچیں........ اور تب ایک بار پھر ان سرد پہاڑوں پر سرما کے سائے پھیلنے لگے۔

وہ وسط جنوری کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی کے مکان میں داخل ہوا۔ میرا حلیہ فقیروں جیسا ہو چکا تھا' لہٰذا راستے میں پڑنے والی بستیوں کے سیدھے سادے لوگ ہمہ وقت میری قدم بوسی کو تیار رہتے تھے بعض ضعیف العقیدہ دیہاتی لوگ مجھ سے بچوں کو دم کرواتے اور تعویذوں کی فرمائش داغتے تھے۔ اول اول مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ اس طرح میں دانستہ طور پر ان کی دل شکنی کر رہا ہوں تو میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ اس راستے پر چلنے میں میرے لیے کچھ آسانیاں بھی تھیں۔ خوراک وغیرہ کا انتظام کسی دردسری کے بغیر ہو جاتا تھا اور رات دو رات گزارنے کے لیے ٹھکانا میسر آ جاتا تھا۔ میرا اپنا خیمہ تو اب تار تار ہو چکا تھا' نقدی بھی قریباً برابر ہو گئی تھی' بھیک مانگنے کا یارا نہیں تھا' فقیر کے بھیس میں ان سب مشکلات کا حل نکل آتا تھا۔

اس روز میں کسی کشمیری کے اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہوا تو صاحب خانہ نے بھاگم بھاگ مجھے خوش آمدید کہا' مکان کی ڈیوڑھی میں ذرا میرے لیے ایک گدیلا بچھا دیا گیا' گڑ کی ابلی ہوئی چائے اور رس میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ میرا ایک راہ چلتا عقیدت مند کچھ ہفتے پہلے مجھے ایک اونی گدڑی نذر کر چکا تھا' یہ گدڑی میرے سخت کوش جسم کے لئے کافی تھی لہٰذا جب ایک عورت اندر سے لحاف لے کر آئی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"لے لو پیر جی' آج بڑی سردی ہے۔" ایک کھنکتی ہوئی آواز نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میں چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا ایک نوخیز پہاڑی دوشیزہ میرے سامنے تھی۔ جیسے میلے بادلوں کی اوٹ میں چاند دمک رہا ہو وہ اپنے جسم کی اٹھان اور پیچ و خم سے بے پروا' بے تکلفی سے کھڑی تھی۔ ایک "پہنچے" ہوئے اللہ لوک کے سامنے تکلف بھی کیسا؟ لے لو پیر جی! آج تو برف بھی گرنے والی ہے۔" اس نے

مقامی لہجے اور دلنشین آواز میں اپنی پیشکش دہرائی۔ اس کے حسن نے میری آنکھوں میں آگ سی لگا دی۔ بے لگام سوچ کے پرندے جبر کا پنجرہ توڑ کر نکلے اور تصور کے پروں سے پرواز کرتے' کرن کے باغ حسن میں چہکنے لگے' اس کے ہونٹوں کے' نشیلی آنکھوں اور گداز جسم کے گیت گانے لگے...... الٹر پہاڑن میری خاموشی کو بھی کوئی ادائے مستانہ سمجھی اور لحاف میرے قریب ڈھیر کر کے لچکتی لہراتی چلی گئی۔

میں اسی طرح اپنی سوچوں میں گم رہا۔ دل ہی دل میں میں حساب لگایا' ایک سال گزر چکا تھا۔ ایک سال کا خیال آتے ہی دل ڈولنے لگا اندازاً" انہی دنوں میں اس کی شادی ہونا تھی' آہ...... برا وقت کتنی جلدی لپکتا ہوا آتا ہے...... شاید اس وقت کرن کے گھر ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی ہو یا اس کے جہیز کے جوڑے ٹانکے جا رہے ہوں یا اس کی ڈولی اٹھائی جا رہی ہو کیا میری ساری ریاضت' ساری اذیت و مشقت رائیگاں جائے گی۔ دل میں آئی کہ اسی وقت اٹھ کر واپس روانہ ہو جاؤں لیکن ارادے کے باوجود میرے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ اور پہلی دفعہ مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ میں لوٹنے سے خوفزدہ ہوں' میں لاشعوری طور پر ان حالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتا جو وہاں مجھے پیش آ سکتے ہیں' شاید میرے یہاں آنے کی وجہ ہی یہی تھی میں گدڑی میں سر دیئے بیٹھا رہا...... سوچتا رہا اور اونگھتا رہا رات اندھیرے کی چادر لپیٹے' سکڑی سمٹی اپنے طویل راستے پر گامزن رہی...... نجانے وہ کون سا پہر تھا' جب کسی کمرے کا دروازہ چرچرایا اور کوئی دبے پاؤں چلتا میری طرف بڑھا۔ میں نے سوچا شاید گھر کا مالک ہے' جاننے آیا ہے کہ "پیر جی" کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں مگر جب آنے والا قریب پہنچا تو مجھے شبہ سا ہوا یہ کسی لڑکی کا سایہ تھا' غالباً وہی لڑکی جس نے چند گھنٹے پہلے مجھے لحاف لا کر دیا تھا۔ وہ اور نزدیک آئی تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ننگے پاؤں تھی' اس کے بال کھلے تھے اور اوڑھنی کندھے پر اس طرح لٹکی ہوئی تھی کہ پاؤں میں الجھ رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے طاقدان میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ مجھے کسی قدیم عمارت کی دیوار میں کندہ شبیہ کی طرح دکھائی دی۔ اس کے جوان جسم پر لباس کی ہر سلوٹ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چونک اٹھا' وہ آنکھیں عجیب بے باکی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں' میرے بالکل قریب پہنچ کر وہ آہستگی سے بیٹھی' کچھ دیر خاموشی سے انگیٹھی کے ادھ بجھے انگاروں کو تکتی رہی پھر اس کی نگاہیں قریب کے لحاف پر گئیں اس نے لحاف اٹھایا اور اسے اچھی طرح لپیٹ کر میرے بالکل پاس سو گئی۔ "یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟" میں

بے پناہ حیرت کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ وہ اب بے خبر سو رہی تھی' دیے کی روشنی اس کے حسین چہرے پر منعکس ہو رہی تھی' اس کے سانسوں کا لمس برچھی کی طرح میری داہنی کلائی پر چل رہا تھا۔ ہر بندے کے اندر ایک اور بندہ چھپا رہتا ہے۔ مجھے خوف آنے لگا' اس شب کی تنہائی میں کہیں وہ ہم نفس بیدار نہ ہو جائے' میں نے آج تک اسے نہایت کٹھن حالات میں بھی سلائے رکھا تھا۔ اس ویرانے میں آنے سے پہلے جب میں ایک معروف کھلاڑی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا' کئی خوبصورت آنکھوں نے میرے کسرتی جسم کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا' کئی نسوانی مسکراہٹیں میرے راستوں میں چمکتی تھیں۔ لیکن میں خود پر مسرت کا ہر دروازہ بند کر چکا تھا' ان ویرانوں میں داخل ہونے کے بعد بھی گاہے بگاہے پہاڑی بستیوں میں معصوم حسن کی دلکشی میری پارسائی کو للکارتی رہی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی بستی کی عقیدت مند عورتیں مجھے گھیر لیتیں تھیں۔ وہ خود ہی مجھے پیر تصور کرتیں اور خود ہی یقین کر لیتی تھیں کہ میں انتہا درجے کا پارسا اور نیک فرشتہ ہوں حالانکہ میں انسان تھا' رگوں میں جوان خون تھا۔ صنف مخالف کی قربت اور کشش مجھے سخت امتحانوں سے گزارتی تھی تاہم میں ہر امتحان میں سرخرو ہوا تھا' میں نے مشقتوں کو غارت کرنے والا وہ در کبھی نہیں کھولا تھا جس پر کرن کے نام کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی مگر...... آج اس شب اور اس تنہائی میں ایک سراپا قیامت' مجسم امتحان بن کر میرے پہلو سے آ لگی تھی۔ میں چور نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور دل کے بے قابو گھوڑے پر کاٹھی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ نجانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی پھر وہ لحاف کے نیچے کسمسائی' اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھے دیکھے بغیر جیسے آئی تھی ویسے ہی بے آواز چلتی واپس لوٹ گئی۔

اگلے روز میرے میزبان نے میرے سامنے نمک والی روٹی اور چائے کا پیالہ رکھا تو میں نے گمبھیر آواز میں پوچھا "تیرا نام؟"

"مردان خان...... پیر جی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے؟"

"جی نیچے وادی میں چھوٹی سے کھیتی ہے۔"

"کوئی پریشانی؟"

"پریشانیاں تو لاکھوں ہیں جی...... لیکن پیر جی...... ایک دعا خاص طور پر

کروائی ہے' آپ سے۔"

"ہاں کہو۔"

"میری بیٹی کو نیند میں چلنے کا مرض ہے جی' بڑی پریشانی رہتی ہے۔ کچھ کریں جی۔"

اب رات کا واقعہ پوری طرح میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ لڑکی خواب کی حالت میں میرے پاس آئی تھی۔ مردان خان مجھ سے اصرار کرنے لگا کہ میں لڑکی کے لیے ضرور کچھ کروں۔ میں حسب عادت دیر تک کہتا رہا "بھلے مانس میرے پاس کچھ نہیں' میں گناہگار بندہ ہوں.......... مجھے خود دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں جتنا انکسار دکھا رہا تھا وہ نیاز مندی سے اتنا ہی دہرا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے ایک کاغذ پر چند الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر اسے دے دیں۔ اس کے علاوہ میں نے باتوں باتوں میں مردان خان پر یہ عندیہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں مزید چند روز اس کی ڈیوڑھی میں قیام کروں گا۔ دراصل برف باری کی وجہ سے موسم بہت سخت ہو رہا تھا' میں چند روز کسی ایک چھت کے نیچے گزارنا چاہتا تھا۔ مردان خان بیچارہ غریب تھا اور زبردست پیر پرست تھا۔ میرے قیام کا سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگا۔

مردان خان کی ڈیوڑھی میں رہتے ہوئے مجھے ساتواں آٹھواں روز تھا' ایک دن مردان خان کا چھوٹا بیٹا میرے لیے گرم پکوڑے لے کر آیا۔ یہ پکوڑے جو ایک اخباری کاغذ میں تھے اس نے حسب دستور میرے سامنے گدیلے پر رکھ دیئے۔ خستہ پکوڑوں کی خوشبو ناک میں گھسی تو میرا ہاتھ خود بخود ان کی طرف بڑھ گیا لیکن اچانک مجھے ٹھٹک جانا پڑا' ساعت کے ہزارویں حصے میں تمام حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ میں اخباری کاغذ کے ٹکڑے کی طرف جھکتا چلا گیا۔ دل سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکلنے کو تھا لرزاں انگلیوں سے میں نے پکوڑے الٹ کر کاغذ کھینچا اور اسے آنکھوں کے عین سامنے رکھ کر دیکھنے لگا۔ کتنا دلدوز نظارہ تھا وہ' میرے سامنے کرن دلہن بنی اپنے دولہا کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ نیچے کیپشن میں دولہا اور دلہن کے نام لکھے تھے اور بتایا گیا تھا کہ پچھلی جمعرات کو ان کی شادی انٹر کان کے سبزہ زار میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

آہ! میری قسمت میں یہ کیا منظر دیکھنا تھا۔ کیا تھا اگر وہ لڑکا پکوڑے لے کر نہ آتا! کیا تھا کہ اگر میں ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا.......... مگر ہونے والی بات ہو چکی تھی' میں اپنی حیات کی خوفناک ترین خبر سے آگاہ ہو چکا تھا.......... مجھے نہیں معلوم کہ میں کب

تک اخبار کا ٹکڑا ہاتھ میں تھامے سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا' شاید چند گھنٹے.......... شاید ساری رات' شاید دو راتیں' میری آنکھوں سے یادوں کے جنازے گزرتے رہے اور جگر کا خون پانی ہو کر رخساروں اور گردن پر ڈھلکتا رہا۔ میری موہوم ترین امیدیں بھی دم توڑ چکی تھیں' نرم حرارت کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے اور برف کی طرح سخت اور اٹل حقیقت سامنے تھی۔ اخبار کی ایک خبر میں چھ جنوری کی تاریخ میرا منہ چڑھا رہی تھی۔ یعنی میرے خدشوں کے عین مطابق کوئی دو ہفتے قبل کرن شہزاد کی شادی ہو چکی تھی۔

.... جس شاخ پر میری مشقتوں کا آشیانہ تھا۔ وہ شاخ ہی کٹ گئی تھی۔ میں تنکا تنکا ہو کر بکھرنے لگا ٹوٹے پھوٹے مایوس انسان کے ملبے سے ایک اور شخص جھانکنے لگا۔ وہ جو ایک مدت سے دنیاوی لذتوں سے دور تھا' ان عذاب ناک لمحوں میں نہ جانے کہاں سے میرے اندر ایک خواہش جاگ اٹھی۔ میں سوچنے لگا' کاش پھر کسی شب مردان خان کی بیٹی نیند میں چلتی ہوئی آئے اور میرے پہلو میں آن لیٹے' پچھتاوے کے دیو میرے اندر اودھم مچانے لگے۔ مجھے یاد آنے لگا کہ میں ایک سراب کے تعاقب میں کیسے کیسے ٹھنڈے میٹھے چشموں کو نظرانداز کر چکا ہوں۔

میں کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے دل کی واردات آپ کو سنا رہا ہوں۔ پچھلے کئی سالوں کی ریاضت کے بعد میرے نفس امارہ کا وہ شدید ترین حملہ تھا۔ اندرون جسم عجیب ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی۔ میں مردان خان کی ڈیوڑھی میں ہر شب لاشعوری طور پر اس آفت جاں کا انتظار کرنے لگا مجھے اپنے تعویذوں کی "کارکردگی" پر پورا بھروسا تھا۔ ان تعویذوں سے مریضہ کو بھلا کیا افاقہ ہوتا! مجھے پوری امید تھی کہ وہ پھر کسی دن خواب کی حالت میں چلتی ہوئی میرے پاس آجائے گی۔ ہر رات میری نگاہیں غیرارادی طور پر اس دروازے کی جانب لگی رہتیں جو اس شب چرچرایا تھا اور ایک حسن بلا خیز لڑکھڑاتا ہوا میرے سامنے آگیا تھا.......... اور بالآخر پانچویں یا چھٹی شب وہ واقعہ رونما ہوا جس کے انتظار میں میں پل پل گھل رہا تھا۔ نصف شب کے بعد کا وقت تھا' یخ بستہ ہوا گھر کے کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک سایہ سا صحن میں نظر آیا۔ اس کی پہلی جھلک نے مجھے سمجھا دیا کہ یہ مردان خان کی لڑکی ہے اور حالت خواب میں باہر نکلی ہے۔ میرے اندر کا شیطان چوکس ہو کر بیٹھ گیا لڑکی حسب معمول بہ آہستگی چلتی میرے پاس سے گزر کر بیرونی دروازے تک گئی' پہلے ہاتھوں سے اس کی کنڈی کھولنے کی کوشش کرتی رہی' کنڈی میں چونکہ قفل تھا اس لئے اسے کامیابی نہیں ہوئی'

کسی الیکٹرانک ٹوائے کی طرح وہ واپس مڑی اور حسب سابق میرے پہلو میں گدڑی اوڑھ کر سو گئی۔ شاید قارئین میری اس وقت کی دلی حالت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا مختصراً یہ سمجھ لیں کہ یخ بستہ تنہائی' حسن کی حرارت اور برسوں کی ناآسودگی نے باہم مل کر ایسی ناقابل برداشت صورت حال پیدا کر دی تھی کہ میں چند لمحوں کے اندر ہزار امتحانوں سے گزر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بدخواہ نے ایک زاہد خشک کی توبہ شکنی کے لیے بطور خاص اہتمام کیا ہے اور فرار کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا' گردوپیش میں ہر ذی روح محو خواب' حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ایک فٹ کی دوری پر بے سدھ' بے ترتیب بے خبر۔ اس لمحے اور اس مقام پر کچھ بھی ہو سکتا تھا.......... اور اس کے بعد میں اطمینان سے گدڑی سنبھال کر اور دیوار پھلانگ کر پہاڑی بھول بھلیوں میں گم ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ناقابل برداشت آسانیاں نظر آ رہی تھیں.......... میرے لرزاں ہاتھ باغ جوانی کی خوشہ چینی کے لیے آگے بڑھے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے مٹھیاں بھینچیں اور انہیں بے دریغ دیوار پر مارنا شروع کر دیا۔ نہایت دیوانگی سے میں دیوار پر مکے رسید کرتا رہا یہاں تک کہ کھال چھل گئی اور خون کہنیوں تک بہہ نکلا۔

جب تسخیر نفس کا مشکل ترین کام ہو چکا تو میں نے لڑکی کا شانہ جھنجھوڑ کر اسے گہری نیند سے جگایا اور جب وہ جاگ کر حیران اور پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگی تو اسے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ اسی وقت ایک اندرونی دروازہ کھلا اور مردان خان تیز قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے جلدی سے اپنے زخمی ہاتھ چھپا لیے۔ شاید میرے مکوں کی دھم دھم نے اسے جگا دیا تھا تاہم اس کا حد سے بڑھا ہوا اظہار عقیدت مجھے ایک اور شبہے میں ڈال رہا تھا۔ غالباً لڑکی کے باہر آنے کے ساتھ ہی وہ بھی جاگ گیا تھا اور دروازے کی اوٹ سے میری حرکات ملاحظہ کرتا رہا تھا..........

اگلے روز دوپہر تک میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ مردان خان رات والے واقعہ سے آگاہ تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے اس حوالے سے بستی میں میری پارسائی کا خوب ڈھنڈورا پیٹا' کچھ لوگوں کے دل میں میرے پیر کامل ہونے میں اگر کوئی شبہ تھا تو وہ بھی دور ہو گیا۔ اردگرد کی کئی بستیوں میں بھی اس واقعہ کا چرچا ہوا اور لوگ جوق در جوق مجھے دیکھنے اور "نیاز" حاصل کرنے آنے لگے۔ یہ سلسلہ' ایک بار شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا' دو تین ہفتوں میں اردگرد کی کئی بستیوں میں میری شہرت پہنچ چکی تھی۔ میں بہت

کہتا کہ میں پیر فقیر کچھ نہیں' اچھا بھلا شیطان آدمی ہوں' لیکن لوگ کب چھوڑتے ہیں.......... ایک دوبار میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا بھی سوچا لیکن برف باری اور راستوں کی دشواری کا خیال کر کے عملی قدم نہیں اٹھایا۔

O------------☆------------O

ایک روز دوپہر کے وقت ایک ادھیڑ عمر عورت کہیں دور سے سفر کرتی ہوئی مجھ سے ملنے پہنچی۔ وہ تھی تو مقامی لیکن لباس اور اطوار سے دیہاتن نہیں لگتی تھی۔ ہاتھ میں طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اس کی امارت ظاہر کرتی تھیں' دوسرے عقیدت مندوں کی طرح وہ بھی اپنا ایک دکھڑا لے کر آئی تھی۔ تنہائی میں اس نے فریاد کی کہ اس کے بیٹے کی شادی کو ایک سال ہو چکا ہے لیکن بچے کی امید نہیں بندھی' اس سلسلے میں اسے کوئی "اکسیر" قسم کا نقش درکار تھا۔ مجھے عورت میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی' مخصوص درویشانہ انداز میں میں نے پوچھا۔

"مائی! کہاں سے آئی ہے؟"

اس نے ایبٹ آباد کے ایک مضافاتی علاقے کا نام لے کر بتایا کہ وہاں ان کی زمینیں وغیرہ ہیں۔ یہ جگہ وہاں سے کوئی بیس میل مشرق کی سمت تھی۔ عورت پہاڑی رستے سے آئی تھی جو سڑک کی نسبت بہت مختصر تھا۔ عورت کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا بیٹا پڑھا لکھا ہے اور زمینداری کے علاوہ اپنے جنگلات سے بھی اسے کافی آمدنی ہے۔ عورت نے بتایا کہ وہ اپنی بہو کو بھی ساتھ لائی ہے اور اگر میری اجازت ہو تو وہ اسے اندر بلا لے۔ میں نے اجازت دے دی تو ایک سرو قد لڑکی کریم کلر چادر میں لپٹی' ٹھٹکتی جھجکتی اندر آ گئی۔ اس نے آدھا گھونگٹ نکال رکھا تھا اور خوبصورت پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر اسے محویت سے دیکھتا رہا۔ میں منتظر تھا کہ شاید وہ اپنی پلکیں اٹھائے۔ اور میں اس کی حسین آنکھوں میں جھانک سکوں لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں عورتوں کے ساتھ ایک چق کی اوٹ سے بات کرتا تھا۔ اسی چق میں سے مجھے تو سب کچھ نظر آتا تھا لیکن عورتیں بغور دیکھنے پر ہی میری صورت سے آشنا ہو سکتی تھیں۔

میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کون تھی یہ میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا.......... میں نے منہ میں کچھ بدبدا کر اس پر پھونکا اور باہر بھیج دیا۔ تب میں کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا ادھیڑ عمر عورت فرط احترام سے پتھر کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ میرا مراقبہ طویل ہو گیا تو عاجزی سے بولی۔ "سرکار کوئی تعویذ لکھ دیں' میرے بچے

کی خوشیاں پوری ہو جائیں۔"

میں نے سر اٹھایا اور گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "مائی، تعویذ چاہیے یا فائدہ؟"

وہ گڑگڑا کر بولی۔ "فائدہ...... میرے سرکار...... فائدہ!"

میں نے کہا۔ "تو پھر...... مجھے تیرے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں۔ کم از کم آٹھ دس روز لگیں گے۔"

عورت کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"میرے اتنے بخت کہ آپ میرے ساتھ چلیں! میں نے تو سوچا بھی نہ تھا، مجھے اور کیا چاہیے سرکار، حکم دیجئے کب چلنا ہے؟"

میں نے کہا "جب فیصلہ ہو گیا تو پھر ابھی چلیں گے، فقیروں کی کوئی تیاری نہیں ہوتی۔" میں نے گدڑی اٹھائی جھولا جھاڑ کر کندھے سے لٹکایا اور لٹھ نما عصا تھام کر تیار ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو عقیدت مندوں نے گھیر لیا، وہ میری روانگی پر حیران و پریشان تھے۔ کئی جوشیلے مریدوں نے میری ٹانگوں سے لپٹنے کی کوشش کی۔ میں نے چیڑ کے ڈنڈے سے ٹھوکے دے دے کر انہیں پیچھے ہٹایا۔ ایک آدھ کو ڈنڈا رسید بھی کرنا پڑا۔ مردان خان نے دست بستہ کہا۔

"سرکار، کیوں چھوڑ رہے ہیں مجھ بد قسمت کو؟"

میں نے کہا۔ "مردان، ہم جیسوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا، چل ہٹ آگے سے۔"

وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں سرکار، آپ کو یہ بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگی، میں ابھی سب کو ڈنڈے مار مار کر یہاں سے بھگا دیتا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا...... آپ یہاں سے نہ جائیے۔"

میں نے میلی کچیلی غضبناک آنکھوں سے اسے گھورا تو وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا...... کچھ ہی دیر بعد میں ادھیڑ عمر عورت، اس کی بہو اور ملازم کے ساتھ خچر پر سوار مشرق کی طرف محو سفر تھا، بستی دم بدم پیچھے رہتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ دست غیبی کس طرح ہمیں ان دیکھے راستوں کی طرف دھکیلتا رہتا ہے۔ کہاں کرن کی گلی اور کہاں یہ برف پوش وادیاں، کہاں فلسفہ اور کہاں جوڈو کراٹے، کہاں پیری فقیری اور کہاں میں۔ جیسے دن میں سے رات پھوٹتی ہے اور غلاظت میں سے پھول برآمد ہوتا ہے، اسی طرح شمال کے راستوں سے جنوبی منازل کی راہیں پھوٹ نکلتی ہیں اور مغرب کی طرف جانے والا مشرق سے نمودار ہو سکتا ہے۔ ہاں، ایک بات ہے، توانائی کبھی فنا نہیں

ہوتی...... اور اعمال کبھی ضائع نہیں ہوتے۔

سردی اپنے عروج پر تھی، ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی وہ ایبٹ آباد کے نواح میں ملک پوری پہاڑ کا دامنی علاقہ تھا۔ آرام دہ کمرے میں آتشدان دہک رہا تھا اور میں بڑی شان سے گھٹنوں پر کامدار کشمیری شال ڈالے صوفے پر بیٹھا تھا۔ (میرے زخمی ہاتھ اب قریباً ٹھیک ہو چکے تھے) میرے سامنے جو شخص تھا اس کا نام رحمت خان تھا۔ وہ مجھے یہاں لانے والی عورت کا بیٹا تھا۔ عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ سرخ و سپید رنگ، تیکھے نقوش اور مضبوط جسم، اسے دیکھتے ہی فلموں کے رومانی ہیرو کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ میری ہی طرح کوئی عاشق دل فگار ہے۔ کسی نے درست کہا ہے، ایک روگی دوسرے کو پہچان لیتا ہے۔ رحمت خان سے اب تک میری جو گفتگو ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک شائستہ اور روشن خیال آدمی ہے۔ وہ سینٹ ڈینیئز اسکول اور لارنس کالج مری کا تعلیم یافتہ تھا، زمینداری اور لکڑی کے کام کو جدید خطوط پر چلا رہا تھا۔ اس کی یہ رہائش گاہ برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک بستی میں تھی مگر اس نے ہر شہری سہولت یہاں فراہم کر رکھی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے کہنے پر میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اول اول تو اس نے مجھ سے ایک طرح کی بیزاری کا اظہار کیا مگر جب اسے اندازہ ہوا کہ میں روایتی پیروں فقیروں سے مختلف ہوں تو وہ دلچسپی سے گفتگو کرنے لگا۔

رحمت خان سے میری یہ پہلی ملاقات خاصی طویل اور حوصلہ افزا رہی۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بظاہر یہ صحت مند اور مطمئن جوڑا اولاد کی نعمت سے محروم کیوں ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے رحمت خان کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح بدک گیا۔ اس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ اس موضوع پر کوئی گفتگو پسند نہیں کرے گا...... تاہم اس کا یہ گریز تادیر برقرار نہیں رہ سکا۔ میری آمد کے ٹھیک چوتھے روز اسی کمرے اور اسی آتشدان کے سامنے ویسی ہی برفانی رات میں بیٹھے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے اس راز پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔ اس وقت تک وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا اور شاید ذہنی طور پر مجھ سے کچھ مرعوب بھی تھا۔ اس نے کہا۔

"پیر صاحب، جو بات میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ اب تک کسی کو نہیں بتائی، حتیٰ کہ میرے قریب ترین دوستوں کو بھی معلوم نہیں۔ یہ آپ کی ذات کا سحر ہے کہ میں زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا ہوں...... پیر صاحب، میں ایک نظریاتی آدمی ہوں، رسم و

رواج اور سماج کی لگائی ہوئی پابندیوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اپنی والدہ کے بے پناہ اصرار پر
میں نے شادی ضرور کر لی ہے لیکن اپنی بیوی سے کبھی میرے ازدواجی تعلقات نہیں
رہے......"

رحمت کے انکشاف نے مجھے حیران کر دیا۔ میرے اوٹنگے بونگے تعویذ تو درکنار،
امریکا کے طبی ماہر بھی سرِدست مسز رحمت خان کی گود ہری نہ کر سکتے تھے' میں نے اپنی
حیرانی پر قابو پا کر پوچھا۔
"لیکن کیوں؟"

رحمت نے ایک طویل اور گہری سانس لی' اپنے سامنے آتشدان کے شعلوں کو
گھور کر تھری کیسل سگریٹ کا کش لیا اور بولا۔ "پیر صاحب' مجھے ایک لڑکی سے بے پناہ
محبت تھی اس کا نام درخو تھا' وہ چندال قبیلے کے سردار باز خان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ وہ
یہاں سے چار پانچ میل دور مشرق کی طرف ترائی میں رہتے ہیں۔ آبی نالے کے پار کی
ساری زمینیں ان کی ہیں۔ ہماری پہلی ملاقات آج سے کوئی چار برس پہلے ہوئی تھی۔ میں
ایک دوست کی برات کے ساتھ باز خان کے گاؤں گیا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں ایک رسم ٹن
کہلاتی ہے' اس رسم کے مطابق لڑکی والے براتیوں پر کوئی شرط عائد کر دیتے ہیں کہ یوں
کرو گے تو برات آگے بڑھنے دیں گے' کبھی نشانے بازی کا امتحان لیا جاتا ہے اور کبھی ان
کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی جاتی ہے۔ اس برات کے راستے میں گاؤں والوں
نے ایک تناور درخت کاٹ کر ڈال دیا تھا اور کہا تھا کہ برات میں سے کوئی اکیلا شخص اس
درخت کو ہٹائے گا تو برات کو گاؤں میں داخل ہونے دیا جائے گا۔ میں نے زور لگا کر اس
درخت کو ہٹایا تھا' اس روز پہلی بار میں نے درخو کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ
ایک چھت پر سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کی یہ مسکراہٹ
میرے دل کا روگ بن گئی...... اور میرے دل کا روگ اس کے دل کا روگ بن گیا۔
اس خوبصورت علاقے کی بھول بھلیوں میں ہماری محبت جوان ہونے لگی۔ ہم نے ساتھ
جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا عہد کر
لیا' میرے والد مرحوم پر میرا یہ راز کھل چکا تھا' وہ سمجھتے تھے میں آگ سے کھیل رہا
ہوں......اور جب بھی سردار باز خان کو اس چکر کا پتا چلا' وہ ایک مصیبت کھڑی کر دے
گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ایک وقت آیا کہ درخو کے اہل خانہ حقیقت حال سے آگاہ ہو گئے۔
تاہم سردار باز خان نے کوئی شدید رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ ایک پڑھا لکھا'

روشن خیال شخص ہے۔ اس نے والد مرحوم کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور عندیہ ظاہر
کیا کہ وہ بچوں کی خواہشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رشتہ کر سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ
اب والد صاحب فوراً حامی بھر لیں گے' یہ رشتہ ہر لحاظ سے ہمارے لائق تھا مگر اس وقت
مجھے سخت کوفت ہوئی جب انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ سردار باز کی
بیٹی سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتی'
فی الحال تم اپنی تعلیم پر توجہ دو اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو والد صاحب
کے رویے نے مجھے اس قدر دل برداشتہ کیا کہ میں لارنس کالج میں پڑھائی ادھوری چھوڑ
کر ایک دوست کے ساتھ تفریحی سفر پر بیرون ملک نکل گیا۔ کوئی چھ ماہ ہم یورپ کے
مختلف ملکوں میں گھومتے رہے' اس دوران مجھے یہ جانکاہ خبر ملی کہ ٹریفک کے ایک حادثے
میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے...... میں فوری طور پر وطن واپس پہنچا' نتھیا گلی سے
ایبٹ آباد جاتے ہوئے والد صاحب کی ٹویوٹا جیپ ایک گہری کھائی میں گر کر نذر آتش ہو
گئی تھی والد صاحب کے علاوہ ان کا ڈرائیور بھی حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔
اس حادثے نے کئی ماہ تک میرے حواس کو معطل رکھا۔ آخر دھیرے دھیرے
مجھے کاروبار زندگی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مجھے لاابالی پن اور بے پروائی کا چلن چھوڑ کر
ذمے داری کا بار گراں کاندھوں پر اٹھانا پڑا۔ تین چار ماہ کی سخت محنت کے بعد میں نے
اپنے تباہ حال کاروبار کو سنبھالا دیا۔ زندگی کچھ معمول پر آئی تو دھیان خود بخود درخو کی
طرف جانے لگا حالانکہ اس حادثے سے پہلے سردار باز خاں سے میرے رشتے کی بات چل
رہی تھی مگر حادثے کے بعد اس نے ایک بار بھی مڑ کر ہماری خبر نہیں لی...... ایک روز
میں ایک کاروباری معاملہ لے کر سردار باز خان کے ہاں پہنچا اور اس بہانے درخو سے ملنے
کی کوشش کی۔ اس سے ملاقات بھی ہوئی مگر یہ جان کر میں ششدر رہ گیا کہ وہ بالکل بدل
چکی ہے۔ اس نے کہا۔

"رحمت' ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں' مجھے اپنے والدین کی عزت جان سے زیادہ
عزیز ہے اور انہیں اب تمہارا مجھ سے ملنا پسند نہیں...... بہتر ہے' آئندہ کبھی اس غرض
سے ہمارے ہاں نہ آنا......!"

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ رخ پھیر کر چلی گئی۔ میں بھی
اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ درخو اور اس کے اہل
خانہ کی یہ بے رخی تادیر برقرار نہیں رہے گی اور حالات جلد ہی سدھر جائیں گے تاہم یہ

میری خام خیال نکلی۔ درخو نے اپنی طرف آنے والے تمام راستے مجھ پر بند کر دیئے تھے۔ باز خان کا رویہ بھی روایتی باپوں جیسا ہو چکا تھا۔ میں دن رات اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ ایک رات والدہ محترمہ کو دل کا دورہ پڑا' سول اسپتال مری کے ایک کمرے میں والدہ محترمہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا کہ میں ان کی بات مان لوں گا اور درخو کو بھول کر کسی موزوں لڑکی سے شادی کر لوں گا............

وعدے کی اس زنجیر نے مجھے یوں جکڑا کہ مفر کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ باپ کے بعد اب میں ماں کو بھی کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا انہیں کوئی صدمہ پہنچانے کے بجائے میں نے تمام صدمے اپنے دل پر جھیل لیے اور............ یوں میری شادی ہو گئی............ پیر صاحب' اب میں آپ کو وہ بات بتانے جا رہا ہوں جو اس سارے واقعے میں آپ کو عجیب ترین لگے گی اور جس کے متعلق میں نے آپ کو شروع میں اشارہ دیا تھا۔ آپ اسے میری روشن خیالی بھی کہہ سکتے ہیں' پاگل پن بھی اور سماج سے کھلی بغاوت کا نام بھی دے سکتے ہیں............ میں آپ کو سیدھے سچے لفظوں میں بتاؤں گا' شادی سے پہلے ہی مجھے کسی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میری بیوی کسی اور کی محبت کا دم بھرتی ہے............ سہاگ رات کو اس کا گھونگٹ اٹھا کر میں نے کہا تھا۔ "محترمہ' اکیلی تم ہی گناہگار نہیں' میں بھی گنہگار ہوں۔ ہم مشرقیوں کی سہاگ راتیں شاذ و نادر ہی ان ندامتوں سے خالی ہوتی ہیں۔"

وہ لرز کر اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی پھر میں نے دھیرے دھیرے بڑی آہستگی لیکن بڑی بے رحمی سے' بڑی نرمی لیکن بڑی سفاکی سے اس کے اور اپنے پھپھولوں پر الفاظ کے نشتر چلانا شروع کیے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں ایک عاشق نامراد ہوں اور میرا دل کسی اور کی مٹھی کا جگنو ہے............ بالکل اسی طرح جیسے اس کی سوچیں کسی اور کے تصور سے بندھی ہوئی ہیں............ وہ کانپتی رہی اور سنتی رہی' سسکتی رہی اور بے حال ہوتی رہی۔ دلہن کے حوالے سے اس کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ خوش ہوتی لیکن میں تو اس کی روح کو چھید رہا تھا۔ سہاگ رات کو یہ گفتگو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ جب وہ سب کچھ سن چکی تو میں نے نرمی سے کہا "عزیزہ' ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دکھ سانجھے ہیں' سماج اور رسم و رواج نے ہمیں ایک ہی طرح لوٹا ہے۔" آؤ' ہم دونوں عہد کریں' محبت کی دشمن دنیا کا یہ آخری وار بھی ناکام بنا دیں گے' اچھے دنوں کی امید کرنا نہیں چھوڑیں گے۔ ہم میاں بیوی ہونے کے باوجود میاں بیوی نہیں ہوں گے' اپنی اپنی نیند سوئیں گے اور اپنے اپنے خواب دیکھیں گے............"

میری بیوی بہت روئی تھی۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے' میرے پاؤں پڑی تھی تاہم میں جانتا تھا' وہ میرے پاؤں نہیں' سماج کے پاؤں پڑ رہی ہے' وہ میری رفاقت کو نہیں اپنے خدشوں کو رو رہی ہے۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا' میں نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا............ اور فیصلہ آج تک برقرار ہے۔ میری بیوی اب میرے مزاج کو اچھی طرح سمجھ چکی ہے اور چار و ناچار حالات سے سمجھوتا کر چکی ہے۔"

سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر رحمت خان نے دھواں فضا میں چھوڑا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی بات مکمل کر چکا ہے۔ کچھ دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے پوچھا۔ "رحمت' یہ صورت حال کب تک جاری رہے گی؟"

"جب تک............ جب تک کوئی انہونی نہیں ہو جاتی پیر صاحب' انہونی کی خواہش آخری ہچکی تک انسان کے سینے میں دفن رہتی ہے............ میں بھی کسی انہونی کا منتظر ہوں شاید کچھ ہو جائے............ شاید!"

میں نے پوچھا۔ "درخواب کہاں ہے؟"

"اپنے باپ کے گھر' ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔"

"کبھی ملاقات ہوئی؟"

"نہیں' کبھی نہیں۔"

"تمہاری شادی کے بعد اس کے خیالات میں کیا تبدیلی آئی؟"

"کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا تم نے کبھی ملنے کی خواہش کی؟"

"ایک آدھ بار لیکن ناکامی ہوئی۔"

"اسے بھول سکتے ہو؟"

"ناممکن بات ہے پیر صاحب۔"

"اچھا' ایک بات بتاؤ' اس کی اچانک بے رخی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

میرے اس سوال پر رحمت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یہی وہ معما ہے پیرجی' جو کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتا۔ میرے بیرون ملک جانے سے پہلے وہ ہر طرح میرے ساتھ تھی' سردار باز خان بھی مجھے بیٹا کہتا تھا۔"

"اچھا............ اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ معلوم نہیں۔"

"کوئی انہونی؟"

"شاید..........!"

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف اور وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں اس کے جذبات سے آگاہ تھا لیکن شاید اسے میرے دل کا احوال معلوم نہیں تھا۔ میرے اندر ایک امنگ پیدا ہو چکی تھی' اس کی مدد کرنے کی امنگ' میں ہجر کا عذاب چکھ چکا تھا اور اب رسمت کی اذیتوں کو سمجھنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "رسمت' میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک رسمت کی خواب دیکھتی آنکھوں میں امید کے دیئے جل اٹھے۔

☆----------O----------☆

یہ بستی دریائے جہلم میں گرنے والی آبی نالے کے شمالی رخ پر مشک پور کے نواح میں واقع تھی۔ یہاں زیادہ آبادی چندال قبیلے سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ سرما کے سب چاروں طرف برف کا تسلط تھا' ورنہ آثار بتاتے تھے کہ بہار میں جھرنے' آبشاریں اور گل بوٹے اس جگہ کو بہشت نظیر بنا دیتے ہوں گے۔ سردار باز خان کو جب پتا چلا کہ ایک فقیر کہیں سے آیا ہے اور دوپہر سے اس کے گھر کے سامنے دھرنا مارے بیٹھا ہے تو وہ خود مجھ سے ملنے چلا آیا۔ گنجے سر اور گھنی مونچھوں والا وہ ایک دراز قامت شخص تھا اس کا رنگ زیادہ سفید نہیں تھا اور جبڑوں اور کنپٹیوں کی بناوٹ اسے ایک سخت گیر شخص ظاہر کرتی تھی۔ اس کے کندھے سے ایک ریوالور لٹک رہا تھا' دو محافظ قسم کے آدمی اس کے ساتھ تھے پہلے تو اس کا کرخت چہرہ دیکھ کر مجھے اپنی پیری فقیری خطرے میں نظر آئی مگر جب اس نے جھک کر مصافحہ کیا اور اس کے بعد اپنے بھدے ہاتھوں کو اپنے زیادہ بھدے چہرے پر ملا تو میری جان میں جان آئی۔

"کہاں سے آئے ہو بابا لوک؟" اس نے نیاز مندی سے پوچھا۔

میں نے دور میرا جانی کی چوٹیوں کی طرف اشارہ کیا جیسے سیدھا وہاں سے اسکینگ کرتا ہوا وارد ہوا ہوں۔ میرے انداز نے اسے اور بھی مرعوب کر دیا۔ وہ بڑے احترام سے مجھے اٹھوا کر اپنے حویلی نما مکان میں لے گیا۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس کی ایک جانب مردان خانہ اور دوسری طرف زنان خانہ تھا۔ مردان خانے کے کمرے کشادہ تھے۔ وہاں جہازی سائز چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور چھوٹی چلم والے حقے رکھے تھے۔ اپنی گدڑی سنبھالتا ہوا میں ایک چارپائی کی طرف بڑھا اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کو ایک طرف دھکیل کر اطمینان سے دراز ہو گیا۔ میری بدتمیزی کو دیکھ کر دو افراد میری طرف بڑھے اور آستین چڑھا کر نہایت عقیدت سے میرے پاؤں دبانے لگے۔ ایک شخص

چائے پانی کا انتظام کرنے بھاگ گیا۔ باز خان کی حویلی میں یہ میرا پہلا دن تھا۔

چند ہی روز میں باز خان کی حویلی کے اندر اور باہر میری فقیری کا خوب سکہ جم گیا۔ بستی میں ایک دو افراد پہلے سے میرے جاننے والے نکل آئے۔ انہوں نے فرط محبت میں میری ایسی ایسی کرامات بیان کیں کہ میں خود سن کر حیران رہ گیا بلکہ کئی بار تو دل چاہا کہ خود ہی اپنی ہاتھ پر بیعت کر لوں........ اب میں آزادانہ مردانے اور زنانے میں قدم رنجہ فرما سکتا تھا۔ زنانے میں دوسری عورتوں کے علاوہ باز خان کی دو بیویاں اور ان کے بچے بھی تھے۔ ان بچوں میں لڑکی ایک ہی تھی یعنی درخو۔ میں اسے پہلی نگاہ میں ہی پہچان گیا تھا' واقعی وہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ رسمت خان کا اس پر فریفتہ ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ میں نے گھونگٹ کی اوٹ سے اس کے چہرے کا صرف ایک حصہ دیکھا لیکن چاند جتنا بھی ہو چاند ہی کہلاتا ہے۔ عورتیں بے تکلفی سے میرے پاس بیٹھ جاتی تھیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے مسائل کا حل پوچھتی تھیں' کالی کھانسی' بستر پر پیشاب' کھٹی ڈکاریں' فضول وسوسے' مالیخولیا........ غرض ہر مرض کے تعویذ گنڈے مجھے دینے پڑے۔ باز خان بے حد مذہبی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے اہل و عیال پر بھی دین داری کا اثر نمایاں تھا۔

ایک روز جب زنان خانے کے دالان میں درخو اکیلی میرے پاس بیٹھی تھی' میں نے پلکیں اٹھا کر اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اور ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "تیرے من پر روگ کا سایہ ہے' کسی کو چاہتی ہے نا تو؟"

درخو کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا پھر اس نے کانپ کر سر جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ "اس کا نام "ر" سے شروع ہوتا ہے اور تیرا "د" سے۔ تم دونوں کا میل ہو سکتا ہے لیکن........ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔"

"نہیں پیر سائیں' وہ مر جائے گا۔" درخو نے تڑپ کر کہا۔ پھر اپنی بے ساختگی پر خود ہی پشیمان ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیوں مر جائے گا؟" میں نے بے پر کی چھوڑی۔ "اس کے نام کا آخری حرف "ت" ہے اور تیرے نام کا آخری حرف "و" یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"درخو نے اشکبار نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر ہاتھ جوڑ کر دھیمی آواز میں بولی۔" پیر سائیں' بس دعا کریں........ دعا کریں کہ اللہ میرے........ اللہ میرے باپ کو سیدھے راستے پر چلائے' ان کی مشکلیں آسان کرے۔"

میں نے وجد میں سر ہلا کر دائیں بائیں جھولنا شروع کیا۔ "مشکلیں آسان ہوں گی ضرور ہوں گی لیکن مشکلیں بہت ہیں ہر کام باری پر ہوگا۔ تو بتا' پہلے کونسی مشکل آسان کرانا چاہتی ہے؟"

درخو کے ہونٹ تھرائے وہ کچھ بتانا چاہتی تھی مگر پھر رک گئی۔ وہ میری توقع سے زیادہ ذہین تھی بات بدل کر بولی۔ "پیر سائیں' آپ تو سب کچھ جانتے ہیں' بس آپ دعا کریں' آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ لڑکی کو مزید کریدنا اسے شیشے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ میں نے جلالی طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامنے رکھی ڈرائی فروٹ کی پلیٹ کو ٹانگ ماری اور "حق ہو" کا نعرہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"سنئے تو۔" درخو نے میرا بازو تھامنے کی کوشش کی مگر میں پاؤں پٹختا اور جھومتا ہوا مردانے میں واپس آ گیا۔

درخو سے میری یہ ملاقات انکشاف انگیز ثابت ہوئی تھی۔ باز خان کا رہن سہن دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کے کردار کا کوئی تاریک پہلو بھی ہے مگر درخو کے ایک فقرے نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا' درخو کے فقرے سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے باپ کو سیدھے راستے پر نہیں سمجھتی........ پھر وہ ٹیڑھا راستہ کیا تھا؟ یہی بات میرے سوچنے کی تھی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ درخو نے رسمت کی موت کا خوف ظاہر کیا تھا۔ کیا اس خوف کا تعلق کسی طرح باز خان کے ٹیڑھے راستے سے تھا؟ بہت سے سوال ذہن میں سرسرانے لگے۔ باز خان کے ساتھیوں میں ایک شخص ایسا تھا جس پر شروع سے مجھے کچھ شبہ سا تھا' اس نوجوان کا نام میراں جان تھا' سرخ و سپید رنگ اور چوڑے چکلے جسم والا یہ نوجوان باز خان کا ہونے والا داماد تھا۔ مجھے یہاں آ کر پتا چلا تھا کہ میراں جان سے درخو کا رشتہ ہونے والا ہے۔ باز خان کے چال چلن پر شک ہونے کے بعد میں نے میراں جان پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی اور میرے لیے یہ کام مشکل بھی نہیں تھا۔ ایک مست حال فقیر کی حیثیت سے میں باز خان کی حویلی میں ہر جگہ دندناتا پھرتا تھا۔ میرے حلیے اور اطوار نے کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

کوئی آٹھ دس روز بعد کا واقعہ ہے' رات کے دس گیارہ کا عمل تھا' میں حویلی کے حجرے یعنی نشست گاہ کی بغل میں ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر پر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جو حجرے میں کھلتی تھی۔ حجرے میں دو تین افراد لیٹے ہوئے

تھی ان میں میراں جان بھی تھا۔ شاید انہوں نے کوئی نشہ وغیرہ کر رکھا تھا' بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ کل مجھے میراں جان کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ مزدا پک اپ نظر آئی تھی' غالباً اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

"کیا باڈی ہے' کیا چمک ہے! دیکھ کر ہی بھوک ختم ہو جاتی ہے۔" میراں جان نے کہا۔

ایک دوست نے شریر لہجے میں پوچھا۔ "اوئے میراں جان' سچ بتا' یہ بات کس کی کر رہا ہے تو؟"

"گاڑی کی اور کس کی؟" میراں جان نے تاؤ کھا کر کہا۔

"اوہ' میں سمجھا شاید............" اس بات پر ہلکا سا قہقہہ پڑا پھر میراں جان کی آواز آئی۔

"ظالم نیچے سے پھسلتی جاتی ہے۔ چڑھائی چڑھاتے جاؤ' مجال ہے ہانپے یا کانپے۔"

قدرت خان نے کہا۔ "ہاں بھئی' ہانپے کانپے گی کیوں' نئی گاڑی ہے.......... اچھا یار چھوڑ ان باتوں کو یہ سنا' کب چاول کھلا رہا ہے شادی کے؟"

میراں جان چمک کر بولا۔ "خدائی خوار' تیرا دھیان وہیں اٹکا ہوا ہے' بن جائے گی تو ماماں بھی' اتنی جلدی کیا ہے۔" اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا۔

قدرت خان نے کہا۔ "ویسے یار گاڑی تجھے اچھی مل گئی ہے قسمت سے لیکن سنبھال کر چلانا۔ تو مدہوش ہے اور رستے بڑے خراب ہیں۔" میراں جان نے شاید اسے گھور کر دیکھا تھا پھر قدرت خان کی آواز آئی۔ "یار' اب میں گاڑی کی بات کر رہا ہوں اور تو خواہ مخواہ دوسری طرف جا رہا ہے' قسم سے میرا مطلب یہی تھا۔"

تیسرے دوست کی آواز آئی۔ "بھئی اس بات کا تو میں بھی گواہ ہوں' میراں اچھا ڈرائیور ہے۔"

قدرت نے کہا۔ "بس ایک بار اس نے غلط ڈرائیونگ کی اور پکڑا گیا۔ بے چارہ رحمت کا باپ............" پھر ایک قہقہہ پڑا۔ یہ قہقہہ ایک دھماکے کی طرح میرے کانوں میں گونجا۔ ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ قدرت خان کا معنی خیز لہجہ ایک خاص سمت اشارہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے رحمت نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نتھیا گلی سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے جیپ کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا تو کیا............ کیا اس کی موت میں باز خان کا کوئی ہاتھ تھا! اندر ہونے والی گفتگو کچھ دیر مزدا جیپ اور درخو کے گرد گھومتی رہی

پھر تینوں دوست خاموشی سے سو گئے۔

☆............O............☆

مزدا پک اپ ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے پتھریلے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ شام کے چار بجے تھے لیکن سورج ابھی سے نتھیا گلی کی چوٹیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ میں جیپ کے عقبی جانب پائیدان پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود میراں جان میری موجودگی سے قطعی بے خبر تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میرا یہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوگا۔ گاڑی چلاتے ہوئے میراں جان کو میری موجودگی کا احساس ہو جائے گا یا ہو سکتا ہے' میرے ہاتھوں کے آہنی کڑوں یا مالاؤں کی کھڑکھڑاہٹ اسے میری طرف متوجہ کر دے' ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس نے مجھے بہلا پھسلا کر دوبارہ حویلی میں چھوڑ آنا تھا یا ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دینا تھا تاہم ایسا نہیں ہوا تھا۔ میراں جان بہت جلدی میں لگتا تھا۔ وہ اندھا دھند گاڑی بھگا رہا تھا۔ میں کیکڑے کی طرح گاڑی کے عقب سے چمٹا ہوا تھا ورنہ زیادہ دیر "شجر سے پیوستہ رہ کر امید بہار رکھنا" ممکن نہیں تھا۔ ایک دو جگہ تو اتنے زور سے جھٹکا لگا تھا کہ باقاعدہ شاخ ہستی پر خزاں طاری ہوتے ہوتے رہی۔ نیچے زمین پتھریلی تھی اور میں جانتا تھا' دانہ خاک میں مل کر بھی گل و گلزار نہیں ہو سکے گا۔

میراں جان کے معمولات کئی دنوں سے میری نظر میں تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد پک اپ لے کر کسی طرف نکل جاتا تھا' وہ ہمیشہ تنہا جاتا تھا اور اس کی واپسی اگلے روز دوپہر کے وقت ہوتی تھی وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے............ آج دوپہر جب وہ اپنے پراسرار سفر پر روانہ ہوا تو میں پہلے سے اس کی تاک میں تھا' جونہی گاڑی حویلی سے نکل کر قریبی درختوں میں آئی میں اچک کر عقبی پائیدان پر سوار ہو گیا تھا اور اب ہمیں اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتے قریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں سوچنے لگا اگر میں واقعی مست حال فقیر ہوتا اور اپنی ترنگ میں اس پائیدان پر آبیٹھتا تو میراں جان کی اندھا دھند ڈرائیونگ مجھے اترنے کا موقع دیئے بغیر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔

تقریباً پانچ بجے گاڑی ایک خشک آبی نالے میں سے گزری اور گھنے درختوں میں رکی۔ گاڑی کے رکتے ہی میں پائیدان سے اترا اور گدڑی سنبھالتا ہوا دیودار کے ایک تناور درخت کی اوٹ میں جا چھپا۔ انجن ابھی بند نہیں ہوا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ میراں جان پھر روانہ نہ ہو جائے۔ جب انجن بند ہوا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ کچھ کھٹ پٹ کی

آوازیں آئیں پھر گاڑی کا دروازہ کھلا اور بند ہوا اور خشک پتے قدموں کے نیچے چرچرانے لگے۔ میں نے تنے کی اوٹ سے دیکھا' میراں جان تیز قدموں سے ایک طرف جا رہا تھا۔ جب فاصلہ مناسب حد تک بڑھ گیا تو میں بھی اوٹ سے نکلا اور پرچھائیں کی طرح اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ٹھٹھرے ہوئے خاموش جنگل میں شام کسی تاریک دھند کی طرح' بے آواز اتر رہی تھی۔ میں حتی الامکان احتیاط سے میرا جان کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ ایک طویل اور دشوار گزار تعاقب تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ہی میراں جان نے ایک ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ روشنی میری مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد آخر کہیں دور سے کچھ مدہم مدہم آوزیں آنے لگیں پھر ایک جگہ تاریکی میں کٹی ہوئی لکڑی کے انبار نظر آئے۔ میں اس لکڑی کا جائزہ لیتے ہوئے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی' محاورتاً بھی اور حقیقتاً بھی۔ بے دھیانی میں پاؤں کسی خلا میں چلا گیا تھا میں ہوا میں ہاتھ پاؤں چلاتا کوئی بیس فٹ نیچے پختہ زمین پر گرا اور پھر لڑھکنیاں کھاتا ہوا کوئی پندرہ فٹ اور نیچے چلا گیا تھا۔ معجزانہ طور پر جسم شدید چوٹوں سے محفوظ رہا تھا صرف ایک کندھے اور گردن کے پچھلے حصے پر کچھ ضربیں آئی تھیں۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک تنگ کھائی میں پایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پاؤں کے نیچے جھاڑ جھنکار' درختوں کی پتلی شاخیں اور چھال وغیرہ بچھی ہوئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ احساس بھی ہوا کہ میں ٹھوس زمین کے بجائے کسی لکڑی وغیرہ پر کھڑا ہوں۔ نیچے جھک کر میں نے درختوں کی نیم خشک شاخیں ادھر ادھر ہٹائیں اور یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ میرے قدموں کے نیچے عمارتی لکڑی کے سلیپر ہیں جنہیں خاص ترتیب سے کھائی کے اندر جوڑا گیا ہے۔ کھائی کی بناوٹ سے ظاہر تھا کہ وہ تنگ ہونے کے باوجود کافی گہرائی تک چلی گئی ہے۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہاں لاکھوں روپے مالیت کی مسروقہ لکڑی کو کیموفلاج کر کے رکھا گیا ہے۔ میں محتاط قدموں سے کچھ آگے گیا اور میری حیرانی دوچند ہو گئی۔ کھائی کافی دور تک چلی گئی تھی اور یہ پورا خلا لکڑی کے شہتیروں سے بھرا ہوا تھا' درحقیقت یہ کھائی ان لکڑی چوروں کے لیے بہت بڑے گودام کا کام دے رہی تھی۔ کھائی کا ایک سرا جو زیادہ تنگ تھا' ایک مسطح زمین پر کھلتا تھا' یہاں پہنچ کر میں نے احتیاط سے جائزہ لیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں باربرداری کے جانوروں کی آمدورفت رہتی ہے' تاریکی میں پاؤں کے نشانات تو نظر نہیں آئے مگر جانوروں کا فضلہ وغیرہ شاید آس پاس بکھرا ہوا

تھا۔ غالباً اس مقام سے لکڑی کو جانوروں پر لاد کر چور راستوں سے محفوظ مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ میں محتاط قدموں سے ڈھلوان طے کر کے اوپر پہنچا' یہاں گھنے درختوں کے اندر چند بڑی بڑی آرا مشینیں لگی ہوئی تھیں اور چاروں طرف لکڑی کا برادہ اور پُرزہ جات بکھرے ہوئے تھے۔ "چوری" کا یہ کام وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا اور مجرموں کی دیدہ دلیری سے صاف ظاہر تھا کہ سرکاری اہلکار ان سے ملے ہوئے ہیں۔

میں ان مناظر میں اتنا محو تھا کہ جب اچانک میرے کندھے پر ایک ہاتھ آیا تو میں بری طرح چونک گیا' مڑ کر دیکھا تو ایک دراز قد شخص دستی آرا کندھے سے ٹکائے سامنے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے خطرناک لہجے میں پوچھا۔

"فف......... فقیر۔" میری منہ سے نکلا اس وقت میری نگاہ چند گز دور آرا مشینوں کی طرف اٹھ گئی۔ میراں جان چند افراد کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف آرہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ جلد ہی اس کی نظر میرے چہرے پر پڑنے والی ہے۔ میں جانتا تھا' میں خطرناک مقام پر کھڑا ہوں اور یہاں میری موجودگی میری موت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا' اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک پتھر کو پھلانگ کر بھاگ نکلا میرے عقب میں دراز قد شخص کی تیز آواز سنائی دی۔

"پکڑو......... پکڑو۔"

یکلخت جیسے خاموش جنگل جاگ اٹھا' بلندی پر بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں' میں نے اپنی گدڑی کسی بڑے مفلر کی طرح گلے میں لپیٹ لی اور تاریکی میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ میرے ہاتھوں کے کڑے اور گلے کی مالائیں جھنجھنا کر ایک پر خوف موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ عقب میں بلند ہوتا ہوا شور اس موسیقی کو اور بھی دہشتناک بنا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اس علاقے کی بھول بھلیوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ہمارا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا' ہمت کر کے میں نے عقب میں دیکھا کئی ٹارچیں آسیبی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چیخ و پکار کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں' وہ لوگ پھیل کر بڑھ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والوں کے ساتھ میری آنکھ مچولی رات کوئی گیارہ بجے تک جاری رہی اونچی نیچی گھاٹیوں اور گھنے درختوں میں حتی الامکان تیزی سے سفر کرتے ہوئے میں نے کوئی پانچ میل کا سفر طے کر لیا لیکن اس وقت جب میں ایک بستی کے بالکل قریب پہنچ

چکا تھا اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے گی' میں پکڑا گیا' تعاقب کرنے والوں کی ایک ٹولی اچانک سامنے سے نمودار ہوئی اور میری طرف لپکی' میں بستی کی گلیوں میں "بچاؤ............ بچاؤ" کا شور مچاتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ یہ بستی سات آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ آدھی رات کو میری چیخ و پکار نے لوگوں کو مضطرب کر دیا' گھروں کے دروازے کھلنے لگے' چند ہوائی فائر بھی ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی پوری بستی کے کتے زورو شور سے بھونکنے لگے۔ مجھے اپنے عقب میں ٹارچوں اور لالٹینوں کا جھمگٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ آخر جونہی میں ایک گلی میں مڑا' چند افراد نے لپک کر مجھے دبوچ لیا۔ اس دوران میرے اصل دشمن بھی پہنچ گئے۔ یوں تو ان کی تعداد کافی تھی مگر وہ ٹولی جس نے سب سے پہلے مجھ تک رسائی حاصل کی' تقریباً سات افراد پر مشتمل تھی۔ وہ سب کے سب بری طرح ہانپتے ہوئے' آنکھوں سے چنگاریاں برسا رہے تھے۔ اس یخ بستہ شب میں انہیں کئی گھنٹے تک خوار کر کے میں نے اپنی بدقسمتی پر مہر ثبت کر لی تھی۔ مجھ تک پہنچتے ہی انہوں نے میری ٹھکائی شروع کر دی۔ شاید وہ سارے ارمان اسی جگہ نکال کر مجھے مرحوم کر دیتے۔ مگر بستی کے لوگ آڑے آئے۔ انہیں اصل صورت حال معلوم نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی فریق کے ساتھ زیادتی ہو جائے۔ میرا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ مالائیں ٹوٹ گئی تھیں اور جسم کے مختلف حصے خونچکاں تھے۔ جوں ہی مجھے کھینچ تان کر روشنی کی طرف لایا گیا' کئی افراد چیخ اٹھے۔ "یہ تو پیر صاحب ہیں۔"

مجرموں میں سے ایک قیم شحیم شخص غرایا۔ "پیر نہیں شیطان کہو! یہ بہروپیا ہے۔"

سانس میرے پیٹ میں نہیں سما رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دینا چاہی تو دو مشٹنڈے پھر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مار مار کر میرا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا پھر گالیاں دیتے اور گھسیٹتے ہوئے بستی کے چوراہے میں لے آئے۔ میری مشکیں کس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا گیا۔ بستی کے لوگ حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے چہروں پر اضطراب تھا۔ شاید وہ مجھے اس سلوک کا مستحق نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے اس بات پر احتجاج بھی کیا۔ مجرموں میں سے دراز قد شخص نے بارعب لہجے میں کہا۔ "تم لوگ وہ بات مت کرو جو تمہیں معلوم نہیں۔ یہ شخص سراسر فراڈ ہے۔ ہم اسے سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ خود کوئی سزا نہیں دیں گے۔"

اس دوران میرا تعاقب کرنے والوں کی دو ٹولیاں اور پہنچ گئیں۔ ان میں سے

ایک ٹولی پک اپ سوار اور دوسری پیدل تھی۔ پک اپ سوار ٹولی میں میراں جان بہ نفس نفیس موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمکنے لگیں' اس کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ مجھے یہیں مار کر گاڑ دینا چاہتا ہے مگر چونکہ یہ سارا معاملہ اب بستی والوں کی نظر میں آ چکا تھا اس لیے وہ کوئی جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا' اس نے اپنے پیش رو کے فیصلے کی تائید کی اور کہا کہ مجرم کو سردار کے سامنے پیش کیا جائے۔ نہایت توہین آمیز طریقے سے مجھے اٹھا کر پک اپ میں پٹخ دیا گیا' پک اپ آہستہ روی سے روانہ ہو گئی تو بستی کے چند جوشیلے لالٹین تھامے ایک جلوس کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ڈرائیور نے دشوار راستے پر رفتار پکڑنا مناسب نہیں سمجھی اور یوں میں سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی معیت میں' ملک پوری کی جانب روانہ ہوا۔

راستہ بھر میراں جان اور اس کے ساتھی مجھے شاندار قسم کی گالیوں سے نوازتے رہے۔ ان کی باتوں سے علم ہوا' جس سردار کے سامنے مجھے پیش کیا جا رہا ہے وہ سردار باز خان ہی ہے۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ میں شارٹ کٹ راستوں کو استعمال کر کے باز خان کی بستی کے بالکل قریب آ نکلا تھا' صرف ڈھائی تین میل کا سفر باقی رہ گیا تھا۔

میری سواری باد بہاری باز خان کی حویلی کے سامنے پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری بستی بیدار ہو گئی۔ لوگ حیرت زدہ نگاہوں سے پک اپ کے اندر جھانک رہے تھے۔ میں چلا چلا کر انہیں اپنے "جرائم" سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر منہ میں کپڑا تھا اور ناک سے صرف گوں گوں کی صدا ہی نکل سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد باز خان اپنے ہونے والے داماد' میراں جان اور دیگر افراد کے ساتھ پک اپ کی طرف آتا دکھائی دیا' ہاتھ میں تسبیح تھی' یوں لگتا تھا تہجد پڑھتا پڑھتا ادھر چلا آیا ہے۔ اس کے انداز و اطوار دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص نہ صرف کالے دھندے میں ملوث ہے بلکہ سفاک قاتل بھی ہے۔ اس کی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ میری کارگزاری سے آگاہ ہو چکا ہے۔ جب اس کے چوڑے جبڑے باہر کو ابھرے اور پھولی ہوئی کنپٹیوں کی چمک نمایاں ہوئی تو مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ مجھے وحشت ناک انداز میں گھورنے اور دانت پیسنے کے بعد باز خان واپس چلا گیا۔ حویلی کے سامنے چند چارپائیاں بچھا کر گیس لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ سردی کم کرنے کے لیے ایک بڑا الاؤ بھی دہکا دیا گیا تھا۔ بستی کے چند بڑے بوڑھوں کے ساتھ باز خان پراسرار مشوروں میں مصروف ہو گیا۔ لوگ چاروں طرف ٹولیوں میں کھڑے جیسے کسی فیصلے کے منتظر تھے۔ پک اپ کے ٹھنڈے فرش پر پڑے

پڑے میرے اعضاء اکڑنے لگے۔ آخر ہجوم میں ہل چل نظر آئی۔ میں نے لوگوں میں ایک بے قراری سے محسوس کی پھر میراں جان ایک نہایت بوڑھے شخص کے ساتھ میری طرف چلا آیا۔ یہ بوڑھا بھی مجھے کوئی اپنے ہی قبیل کا نظر آیا' اس کے بال جٹاؤں جیسے تھے اور گلے میں پتھروں کی مالائیں۔ قریب آ کر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' وہ ایک مقامی پیر تھا اور اسے لوگ اللہ ہو والا' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

جوں ہی پیر اللہ ہو والا میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فارغ ہوا' پک اپ حرکت میں آئی اور مجھے ایک نامعلوم مقام کی طرف لے چلی۔ بستی کے لوگ اب پیچھے رہ گئے تھے۔ میں تاریکی میں ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن مختلف آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سارے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

پک اپ کوئی دو میل اونچے نیچے راستے پر چلنے کے بعد ٹھہر گئی۔ یہاں پہنچ کر میرے پاؤں رسی کی بندش سے آزاد کر دیئے گئے۔ منہ سے کپڑا بھی نکال لیا گیا میں نے دیکھا کہ میں دس پندرہ مسلح آدمیوں کے نرغے میں ہوں۔ ایک آدمی.......... نے مجھے جدید رائفل سے ٹہوکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔ میں جانتا تھا یہاں میری فریاد پر کان دھرنے والا کوئی نہیں اور چیخ و پکار بے کار ہے' کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اگر دل میں کوئی امید تھی تو یہی کہ شاید رحمت میری مصیبت سے آگاہ ہو جائے میری کچھ مدد کرے.......... لیکن کیسے؟ یہ لوگ تو شاید ابھی قصہ تمام کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ سارا علاقہ برف سے ڈھکا ہوا تھا اور تیز ہوا ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہوتی تھی۔ میرے پہرے دار مجھے دھکیلتے ہوئے بلندی کی طرف لے جانے لگے۔ ایک دشوار چڑھائی چڑھا کر وہ مجھے ایک برفانی کھوہ میں لے آئے' ایک جانب بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ کھوہ مکمل طور پر برف کے اندر تراشی ہوئی تھی مجھے کھوہ میں دھکیل دیا گیا۔ یہاں ایک وزنی پتھر میں دو آہنی کنڈے نصب تھے۔ ان کنڈوں کی موجودگی کی وجہ میری سمجھ میں اس وقت آئی جب ایک مضبوط رسی کے ذریعہ مجھے اس پتھر سے باندھ دیا گیا۔ باندھنے کے بعد جب مسلح افراد باہر جانے لگے تو میں نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "بھائیو! کچھ تو بتاتے جاؤ.......... یہ سب کیا ہو رہا ہے!"

مجھے اندر لانے والے دو افراد تو ناک بھوں چڑھا کر باہر نکل گئے لیکن تیسرا جو نسبتاً باتونی تھا' کڑے لہجے میں بولا۔

"اس جگہ کو "پیر کھوہ" کہا جاتا ہے.......... یہاں پر جھوٹے سچے کی پہچان ہوتی

ہے۔ پیر اللہ ہو والا کے حکم کے مطابق تجھے اب آٹھ پہر یہاں رہنا ہوگا۔ اگر تو سچا ہے تو بچ جائے گا ورنہ کل اسی وقت آ کر ہم تیری لاش اٹھا لے جائیں گے۔"

اچانک مجھے صورت حال کی اصل سنگینی کا احساس ہوا' جیسا کہ اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا' یہ دو اطراف سے کھلی تھی یعنی ایک راستہ تو وہ تھا جہاں سے مجھے لایا گیا تھا لیکن کوئی دوسرا راستہ بھی تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ نہایت تیز ہوا فراٹے بھرتی ہوئی کھوہ میں سے گزر رہی تھی۔ ایسے بلند اور تنگ دروں میں ہوا ویسے بھی تیز ہوتی ہے اور یہ تو تھا ہی برفانی علاقہ' میرے جسم پر ایک تار تار لباس تھا اور جسم زخموں سے چور' میں سمجھ گیا کہ اس سرد ترین مقام پر میں چند گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکوں گا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ امتحان وغیرہ کچھ نہیں' مجھے سیدھا سیدھا موت کے منہ میں دھکیلا گیا ہے۔ معلوم نہیں سردار باز خان کے ایماء پر پیر اللہ ہو والا اس سے پہلے کتنے بدنصیبوں کو اس عذاب سے دوچار کر چکا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا دور دراز علاقہ بھی نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا ان بستیوں میں اس طرح کے حادثے رونما ہوتے رہے ہیں اور رسم و رواج اور عقائد کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگ کبھی تھانے کچہری تک نہیں پہنچے۔ عجب طرفہ تماشا تھا جب میں جھوٹا تھا تو لوگ مجھے سچا ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں چھوتے تھے اور ہاتھ چومتے تھے.......... اور اب جبکہ میرے پاس بولنے کے لیے ایک دھماکا خیز سچ تھا' مجھے جھوٹا گردانا جا رہا تھا اور ایک بااثر مجرم ہمیشہ کے لیے میری زبان بندی کا انتظام کر رہا تھا.......... کر کیا رہا تھا کر چکا تھا.......... اور اب موت میرے روبرو تھی۔

O------------☆------------O

رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ مجھے برف کی اس قبر میں موت کا عذاب جھیلتے کوئی بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ مجھے خود پر حیرت تھی کہ میں ابھی تک زندہ ہوں شاید میں صرف زندگی کا خواب دیکھ رہا تھا' پچھلے آٹھ دس گھنٹوں سے کئی عجیب و غریب مناظر میری خوابناک آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ کبھی میں حرارت بخش آگ کا الاؤ روشن دیکھتا' یہ آگ اپنے شعلوں کی زبانوں سے میرے زخم زخم' عریاں جسم پر گدگدی کرتی' پھر مجھے محسوس ہوتا کہ یہ مہرباں آگ دراصل کرن ہے' میری بچھڑی محبت' مجسم شباب اور رعنائی میرے اوپر جھکی ہوئی ہے۔ اپنے نرم ہونٹوں سے میرے زخم کو چوم رہی ہے مجھے اس کے جسم سے گرم قہوے کی مہک آتی۔ میں سوچتا یہ کرن ہے یا قہوے کی پیالی' پھر بچ

بچ وہ قہوے کی پیالی بن جاتی، میں اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا، اچانک قہوے کی پیالی پھیلتی جاتی اور سمندر بن جاتی۔ اس کی اندر مجھے درخو اور رسمت کے چہرے نظر آتے۔ میں دیکھتا، وہ ڈوب رہے ہیں، ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں، فریاد کر رہے ہیں "پیر جی! ہمیں بچاؤ تم جھوٹے پیر ہو یا سچے پیر ہو...... لیکن تم ہمیں بچا سکتے ہو...... اپنی کرن کا صدقہ، ہمیں بچاؤ......"

نہ جانے وہ کیا کیا الٹے سیدھے خواب تھے جو میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھے۔ ان بیس گھنٹوں کی اذیتیں، حسرتیں اور تڑپ بیان کر کے میں کہانی کو مزید طول نہیں دینا چاہتا، بس یہ سمجھ لیں کہ وہ بیس گھنٹے سرد جہنم کی بیس ہزار تہیں تھیں جن سے میں گزرا تھا۔ میرے لیے خوشی کی صرف ایک ہی بات تھی کہ میں ابھی زندہ تھا۔ شاید پچھلے ایک برس کی نفس کشی اور سخت کوشی میری موت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی، اب مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں باقی کے تین چار گھنٹے بھی کسی نہ کسی طرح گزار لوں گا۔

اچانک مجھے قریب ہی کہیں آہٹ سی محسوس ہوئی، کھوہ کے دہانے پر دو سائے نظر آئے، وہ ایک پتھر کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ مجھے اسی طرح دیکھ کر گئے تھے مگر اس وقت مجھ پر غشی سی طاری ہو رہی تھی اور میں نے ان سایوں کو وہم سے تعبیر کیا ہو گا۔

ایک غصیلی آواز کھوہ میں گونجی۔ "زندہ ہے حرامزادہ۔" دوسری آواز آئی۔ "ٹھیک ہے کھول دو۔"

یہ آواز میراں جان کی تھی یعنی درخو کے ہونے والے شوہر کی، اس نے مجھے کھولنے کا حکم دیا تھا، تین آدمی میری طرف بڑھے۔ تیز ہوا میں ان کے لباس پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ روشنی میں انہوں نے بغور میرا چہرہ دیکھا پھر کسی نے غرا کر ایک ٹھوکر میری پسلیوں میں ماری، ایک دراز قد شخص میری طرف جھک آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریزر بلیڈ تھا، بلیڈ کے ذریعے اس نے میری رسیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ رسیاں کھولنے کے بجائے کاٹ کیوں رہا ہے؟ اور اگر کاٹنا بھی ہے تو کوئی چاقو وغیرہ استعمال کیوں نہیں کرتا؟ تقریباً دس منٹ میں اس نے میری رسیاں کاٹ کر مجھے آزاد کر دیا۔ ایک خودکار رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"چلو باہر نکلو...... ذرا تمہاری جاسوسی نکالیں۔" میراں جان نے حسب معمول ایک گالی دے کر مجھے باہر کی طرف دھکیلا۔ میں لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا ہوا کھوہ کے دہانے کی

طرف بڑھا، کھوہ سے باہر نکلتے ہی میں جیسے دوزخ سے برزخ میں آ گیا۔ ہوا کی ہلاکت خیز کاٹ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میرے کرم فرما مجھے دھکیلتے ہوئے کھوہ سے کوئی پچاس گز نیچے لے گئے، پھر اچانک...... کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ مجھ پر پل پڑے، جبڑے پر چند زوردار مکے پڑے تو کھوپڑی روشن ہو گئی اور اس کی ساتھ ہی ساری حقیقت میری سمجھ میں آ گئی...... میری سخت جانی سے مایوس ہو کر باز خان نے کھوہ سے میرے فرار کا ڈرامہ رچایا تھا۔ اب میں ایک مفرور شخص تھا اور پہرے داروں کو مجھے جان سے مارنے کا پورا حق حاصل ہو گیا تھا۔ چند ساعتوں میں مستقبل کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اپنی لاش میرے تصور میں آئی۔ ٹوٹی ہوئی پسلیاں، تقسیم شدہ سر، پچکا ہوا پیٹ اور سینے میں گولیوں کے سوراخ!

مارنے والے مجھے بے دریغ مار رہے تھے لیکن ایک بات سے وہ یکسر بے خبر تھے۔ ان کی مار کھانے والا اور ان کے ہاتھوں زخم زخم ہونے والا ماضی کا ایک نامور فائٹر تھا۔ ملک کے صف اول کے کھلاڑیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا...... اس کے فقیری چولے میں ایک پروفیشنل لڑاکا ابھی تک زندہ تھا...... میں نے خود کو سفاک قاتلوں میں گھرا ہوا پایا تو زندگی کی خواہش قوت بن کر میرے ہاتھ پاؤں میں دوڑ گئی۔ میں نے سنبھالا لے کر خود کو دفاع کے لیے تیار کیا۔ میرے مقابل میرا جان سمیت کوئی چھ افراد تھے۔ انہوں نے مجھے تین اطراف سے گھیر رکھا تھا...... میں لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا...... رکا...... سیدھا ہوا...... اور برفیلی تاریکی میں اپنا ہدف تلاش کرنے لگا۔

اس رات، اس تاریک ڈھلوان پر چیڑ، دیودار اور شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان میں نے اپنی زندگی کی یادگار لڑائی لڑی۔

برسوں کی ناکامی اور لاحاصل ریاضتیں ان چند لمحوں سے خراج وصول کر گئیں۔ میں نے خالی ہاتھ ان چھ افراد کو پرانی روئی کے مانند دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے ان کے پھٹے ہوئے سر، ٹوٹے ہوئے بازو اور خونچکاں چہرے نہیں دیکھے لیکن اندھیرے میں خوفزدہ چیخوں اور کراہوں کا زیروبم سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا۔ یہ حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ کم از کم پانچ افراد وہیں پر کھیت رہے، صرف ایک شخص موقع سے بھاگ سکا...... چند لمحے بعد میں نے ایک خودکار رائفل اٹھائی اور سمت کا تعین کر کے تاریکی میں دوڑتا چلا گیا۔

درختوں اور دشوار گزار گھاٹیوں میں پیدل سفر کرتا میں تقریباً دو گھنٹے میں رسمت

خان کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ رحمت تک میری رسائی میری بہت بڑی کامیابی اور باز خان کی زبردست شکست تھی۔ اس رات اور اگلے روز یکے بعد دیگرے بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ ان میں باز خان کی خفیہ آرا مشینوں پر پولیس کی بھاری جمعیت کا چھاپا بھی شامل تھا۔ باز خان خطرے کی بو سونگھ کر یہ اڈا خالی کر چکا تھا مگر وہاں کچھ ایسے شواہد باقی رہ گئے تھے جن سے پولیس کو باز خان کے ایک اور ٹھکانے کا سراغ مل گیا اور اس ٹھکانے سے باز خان اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہوا۔ گرفتار ہونے والوں میں ہٹا کٹا میراں جان بھی شامل تھا۔ پیر کھوہ کے قریب میرے ہاتھوں پٹنے اور ناک تڑوانے کے بعد وہ باز خان کی بغل میں جا چھپا تھا۔ در حقیقت میراں جان ہی نے رحمت کے والد سلطان خان اور اس کے ڈرائیور کو قتل کیا تھا' تھانے میں پہنچ کر جب بڑے مجرم باز خان اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو اچانک باز خان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ تھانے سے سیدھا سول اسپتال مری جا پہنچا۔ وہاں سے اسے راولپنڈی منتقل کیا گیا۔ پانچ روز کی مسلسل کوشش کے بعد ڈاکٹروں نے اس کی جان بچالی مگر اس کا نصف دھڑ بدستور بے حس تھا۔ قوت گویائی بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ موت کو اس قدر قریب اور زندگی کو اتنا گریزپا دیکھ کر باز خان نے چند کاغذات منگوائے اور ان پر اپنا طویل اقبالی بیان اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اس بیان سے جو حالات سامنے آئے وہ یوں تھے۔

باز خان ایک عرصے سے جنگل کی غیر قانونی کٹائی میں مصروف تھا۔ اسکے علاوہ مختلف اوقات میں وہ اسلحے کی اسمگلنگ میں بھی ملوث رہا تھا۔ یہ کالے کام وہ اتنی صفائی سے کرتا تھا کہ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود کسی کو اس کے کردار پر شبہ نہیں ہوا تھا لیکن کب تک؟.......... آخر رحمت کے والد سلطان خان کو باز خان کے کرتوتوں کی بھنک پڑ گئی' باز خان کو بھی پتا چل گیا کہ سلطان خان اس کے راز سے آگاہ ہو چکا ہے......... نہایت ہوشیاری سے اس نے سلطان خان کو ترغیب دی کہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں چونکہ دونوں کا کام لکڑی کا ہے اور متعلقہ لوگوں سے تعلقات ہیں لہٰذا دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ ہوگا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ باز خان کی نظر سلطان خان کے ایک برادر نسبتی پر تھی۔ یہ شخص ہائی وے پولیس میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھا اور باز خان مال کی ترسیل میں اس سے مستقل فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ اس نے سلطان خان سے رشتے داری بنانے کی کوشش کی' دوسری طرف سلطان خان' باز خان کے عزائم سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک نہایت خطرناک شخص ہے اور

دہشت گرد لوگوں سے اس کا رابطہ ہے لہٰذا وہ اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب رحمت نے درخو سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا' بعد میں رحمت بیرون ملک چلا گیا' اس دوران باز خان نے اپنے راستے کا کانٹا ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔ اس نے سلطان خان کو قتل کرا دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے میراں جان کو استعمال کیا' میراں جان اس کا ایک دور کا رشتے دار تھا اور ہر خطرناک کام کر گزرتا تھا۔ اس نے دوران سفر پہاڑی سڑک پر سلطان خان کی جیپ کو سائڈ ماری اور اسے دونوں سواروں سمیت سیکڑوں فٹ گہری کھائی میں پہنچا دیا۔ اس کارنامے کے عوض باز خان نے اسے درخو کا ہاتھ سونپ کر عزت بخشی اور اپنا دست راست بنا لیا۔ اس وقت اسے کہاں گمان تھا' ایک روز میراں جان کو مقدمہ قتل کا سامنا کرنا ہو گا۔

درخو بھی اپنے باپ کے دھندے اور اس کے گھناؤنے کردار سے آگاہ ہو چکی تھی لیکن وہ اس سے سخت خوفزدہ بھی تھی۔ رحمت کی وطن واپسی پر اس نے باپ سے بغاوت کی ایک کمزور سی کوشش کی لیکن باز خان نے اسے بری طرح سمجھا دیا۔ اس نے کہا کہ اس کی شادی اب میراں جان ہی سے ہوگی اور اگر اس نے رحمت سے ملنے کی کوشش کی تو باپ کی طرح اس کی جلی ہوئی لاش بھی کسی گہری کھائی سے ملے گی.......... ذہین درخو جانتی تھی یہ محض دھمکی نہیں لہٰذا اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے ہونٹ ہمیشہ کے لیے سی لیے۔ وہ دن رات جدائی کی آگ میں جلتی رہی مگر حرف فریاد زبان تک نہیں آنے دیا۔ یہاں تک......... یہاں تک کہ اس تخشری ہوئی سہ پہر کو میں نے اپنی میل بھری آنکھوں سے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ "تیرے من پر کسی روگ کا سایہ ہے' کسی کو چاہتی ہے نا تو؟ اس کا نام "ر" سے شروع ہوتا ہے اور تیرا "د" سے.........."

پنڈی کے اسپتال میں چند روز بعد باز خان پر بیماری کا ایک اور حملہ ہوا۔ موت سے چند گھنٹے قبل اس نے وکیل کو جو وصیت نامہ لکھوایا اس میں ایک پیرا یہ بھی تھا "میں اپنی اکلوتی بچی کے ساتھ اب تک بہت ظلم کرتا رہا ہوں۔ وہ ایک مجرم باپ کی بیٹی ضرور ہے لیکن خود فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ اگر سلطان خان کا بیٹا رحمت خان اب بھی اس سے شادی کا خواہاں ہے تو میں اس کا ہاتھ بخوشی رحمت خان کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ پرانے رواجوں کی وجہ سے ان دونوں خاندانوں میں بھی کوئی جان لیوا دشمنی چل نکلے' جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔"

.... باز خان کی موت کے بعد اس کے اقبالی بیان کی روشنی میں پولیس نے

وسیع پیانے پر کاروائی کی۔ کراچی سے خیبر تک کئی مجرم اور ان کے معاونین پکڑے گئے اور یوں جرائم کی ضخیم کتاب میں سے کم از کم ایک ورق پھاڑ لیا گیا............ میں رسمت اور درخو کی شادی تک وہاں رکنا چاہتا تھا لیکن میرے لیے بڑی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ میری شہرت اردگرد کی تمام بستیوں میں پہنچ چکی تھی۔ لوگ جوق در جوق اس پیر باکمال کو دیکھنے آرہے تھے جس نے راتوں رات پھونک مار کر جرائم کے ایک بہت بڑے برج کو الٹا دیا تھا اور پیر کھوہ کے امتحان میں بھی اس کی سچائی ثابت ہوئی تھی۔ کھوہ کے قریب باز خان کے چھ گماشتوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑنے کو بھی میری ایک زبردست کرامت سمجھا جا رہا تھا۔

اس رات میرے منع کرنے کے باوجود رسمت خان دیر تک میری ٹانگیں دباتا رہا۔ آتش دان کے شعلے اس کے پر تفکر چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔

"کیا بات ہے رسمت؟" میں نے پوچھا۔

اس نے طویل سانس بھر کر کہا۔ "میں سوچتا ہوں پیر جی! درخو ایک لڑکی تھی۔ اسنے تو مجھ شادی شدہ کو قبول کر لیا مگر............ مگر اس عورت کا کیا بنے گا جسے لوگ میری بیوی کے طور پر جانتے ہیں میں اس سے علیحدگی ضرور اختیار کرنا چاہتا ہوں لیکن اسے بے سہارا کر کے پھینکنا نہیں چاہتا۔ میں اسے منزل پر پہنچانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس کے محبوب کو تلاش کروں اور اسے سب کچھ بتا کر اس بات پر راضی کروں کہ وہ اسے قبول کر لے۔ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ کیا وہ اسے قبول کر لے گا............ اور کیا دنیا والے اس صورت حال کو تسلیم کر لیں گے............؟"

میں نے کہا۔ "میرے بھائی! میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟............ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "میری کشتی کنارے لگی ہے تو میں اس مظلوم کی کشتی بھی کنارے ضرور لگاؤں گا' چاہے کیسی بھی قربانی دینا پڑے۔"

میں نے روانی میں کہا۔ "میرا خیال ہے' کسی بڑی قربانی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے شادی کر لیتا ہوں۔"

"آ............ آپ پیر جی!" رسمت حیرت سے گنگ ہو رہا تھا۔

"ہاں میں............ بقلم خود۔" رسمت کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر پاؤں آگ کے پاس کیے اور ٹیک لگا کر کہا۔ "رسمت! تم اکثر پوچھتے ہو کہ میں نے تم پر اتنی عنایت کیوں کی............ کیوں تمہارا اور درخو کا راستہ ہموار کرنے کے لیے خود کو شدید خطروں میں جھونکا اور باز خان سے ٹکر لی۔ اس سوال کا جواب چاہتے ہو نا؟"

"ہاں............ ہاں۔" رسمت نے کسی معمول کی طرح سر ہلایا۔

میں نے ابھی داڑھی کو لمبے ناخنوں سے کھجایا اور کہا۔

"تمہاری بیوی............ جو تمہاری بیوی نہیں ہے............ میری محبوبہ ہے میری محبوبہ کرن' میں اسی کے نام کا جوگ لے کر کئی مہینوں سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہا ہوں............"

رسمت خان کرسی سے اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ وہ حیرت ناک نگاہوں سے مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے چولے کے اندر سے اخباری کاغذ کا وہ ٹکڑا نکالا جو ڈھائی ماہ پہلے مجھے مردان خان کے گھر پکوڑوں کے نیچے سے ملا تھا۔ "یہ دیکھو' یہی تمہاری بیوی ہے نا" میں نے تیل آلود تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" رسمت خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔" پچھلے سال جنوری میں ہماری شادی ہوئی تھی۔"

درحقیقت یہ اخبار کوئی سوا برس پہلے کا تھا۔ میری معلومات کے بالکل برعکس کرن کی شادی پچھلے سال ہی ہو گئی تھی۔ میرے گھر چھوڑنے کے دو ہفتے بعد ہی کرن کے چچا فوت ہو گئے تھے اور اس کی چچی نے عجلت میں جیسے تیسے کرن کا بار سر سے اتار دیا تھا۔ اخباری کاغذ پر چونکہ صرف مہینہ اور تاریخ درج ہوتی ہے اس لیے میں یہی سمجھا کہ کرن کی شادی اسی برس ہوئی تھی۔

میں نے رسمت سے کہا۔ "میں ہی وہ شخص ہوں' جسے تم تلاش کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اب کہو' تمہیں کرن کی کشتی کنارے لگانے میں زیادہ مشقت تو نہیں کرنا پڑے گی؟"

وہ منہ پھاڑے میری صورت دیکھے چلا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر برفانی ہوا سرنج رہی تھی اور شب کی تیرگی وادی وادی اور چوٹی چوٹی ان کہی کہانیوں کا فسوں پھونک رہی تھی۔

☆............○............☆

ٹھیک ایک ماہ بعد جب اس پہاڑی بستی میں رسمت اور درخو رشتہ ازدواج میں

منسلک ہو رہے تھے' میں اپنی نوبیاہتا بیوی کرن کے ساتھ اسلام آباد کے بین الاقوامی ائر پورٹ پر کھڑا تھا۔ کرن کی شرمیلی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ میں کلین شیو اور تھری پیس سوٹ میں ہمیشہ سے زیادہ اسمارٹ نظر آرہا ہوں۔ ستاروں بھری چمکیلی ساڑھی میں وہ بھی کوئی حسین ساحرہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کرن اسی روز میری موجودگی سے باخبر ہو گئی تھی جب میں' کرن اس کی ساس اور اس کا ملازم خچروں پر سوار ان کے گاؤں روانہ ہوئے تھے۔ اس نے عقلمند عورت کی طرح اپنے لبوں پر مہر ثبت کرلی تھی اور خاموشی سے حالات کا اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی تھی۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا تھا لیکن ابھی میرا وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ میں فی الحال انگلینڈ جا رہا تھا جہاں رسمت کے ایک دوست کو میری رہائش اور روزگار کا انتظام کرنا تھا۔ وہاں سیٹل ہونے کے بعد ہی میں اپنے بچھڑے ہوؤں سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا جہاں تک کرن کا سوال تھا اس بیچاری کا اب دنیا میں اور کون تھا؟ چچی اور چچی کی اولاد سے اس کے روابط اتنے ہی تھے جتنے ایک دور پار کے ناپسندیدہ رشتے دار سے دوسرے رشتے دار کے ہو سکتے ہیں۔ کرن کی کچھ جائیداد تو چچا چچی ہتھیا چکے تھے' باقی اسلام آباد میں تھی ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اسے فروخت نہیں کریں گے اور وطن واپسی کے لیے کسی اچھے وقت کا انتظار کریں گے۔ کسی ایسے وقت کا جب ہمارے معاشرے میں محبت کرنے والوں کے لیے حالات اتنے سخت نہیں رہیں گے' جب مہرو وفا کی رسم چلے گی اور جب اندھے سماج کے باغیوں کو معاف کرنے کا وتیرہ رواج پا جائے گا۔ یہ ہے تو انہونی خواہش لیکن رسمت کی زبان میں' جب انہونیاں تاج محل کی صورت ڈھل جاتی ہیں تو پھر انہونیاں نہیں رہتیں۔ ایک زمانہ آگرہ جا کر انہیں دیکھ سکتا ہے.......... انہیں چھو سکتا ہے۔